طلوع اسلام

ماہ دسمبر
۱۹۵۲

-/10/-

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ

(۱) تنہا فکرِ انسانی (عقل) زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔

(۲) یہ **وحی** اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے اسلئے نوعِ انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔

(۳) حق اور باطل کا معیار قرآن ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن کے مطابق ہے صحیح ہے جو اس کے خلاف ہے غلط ہے۔

(۴) حضور نبی اکرمؐ انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن عجمی سازشوں نے ہماری تاریخ میں بہت سی ایسی چیزیں شامل کر رکھی ہیں جن سے حضورؐ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ ہماری تاریخ کے ایسے تمام حصے (خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں) یکسر غلط اور وضعی ہیں۔ حضورؐ کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآن کریم ہے۔

(۵) قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔

(۶) اس عالمگیر نظامِ زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں (انھیں قوانین شریعت کہا جاتا ہے) یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔

(۷) اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا (اسے ربوبیتِ عامہ یعنی "تمام نوعِ انسانی کی پرورش" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔)

(۸) ربوبیتِ عامہ کے مقصدِ عظیم کے حصول کیلئے (قرآن کی رو سے) ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے اسے "قرآنی نظامِ ربوبیت" کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ

ابتداءً پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں، قرآنی نظامِ ربوبیت نافذ ہو جائے تاکہ صفاتِ خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی دبی ہوئی صلاحیتیں کامل نشوونما پا سکیں اور اس طرح

"زمین اپنے پروردگار کے نور سے جگمگا اٹھے"

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوعِ اسلام کا ساتھ دیجئے۔

قرآن نے کیا کہا؟

ہندو مت نے کہا کہ غریب اس لئے غریب ہے کہ وہ برہما کے پاؤں سے پیدا ہوا ہے اور امیر اس لئے امیر اور صاحبِ اقتدار ہے کہ وہ برھما (خدا) کے سر سے پیدا ہوا ہے۔ اس لئے جسے برھما نے غریب پیدا کیا ہے وہ غریب رہے گا۔ اسے برھما کے فیصلہ پر شاکر رہنا ہوگا۔ اس نے غریب سے یہ کہا اور امیر سے کہا کہ تم دان (صدقہ خیرات) کے کچھ ٹکڑے غریبوں کی جھولی میں ڈال دیا کرو۔ یہ پُن (ثواب) کا کام ہے۔

عیسائیت نے کہا کہ دنیا کی بادشاہت امیروں کے لئے ہے اور غریب خدا کے پیارے ہیں اس لئے ان کی بادشاہت آسمان پر ہے غریبوں کو امیروں پر رشک نہیں کرنا چاہئے بلکہ خدا کا شکر کرنا چاہئے کہ اس نے انھیں دولتمند نہیں بنا دیا ورنہ وہ آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہو سکتے۔

زرتشت والوں نے کہا کہ امیری اور غریبی سب مقدر سے ملتی ہے۔ قسمت کا لکھا کوئی نہیں مٹا سکتا۔ غریب کی تقدیر میں غریبی ہے اور امیر کی تقدیر میں امیری۔ اس لئے غریب کو اپنی قسمت پر قانع رہنا چاہئے اور امیروں کو چاہئے کہ اپنی دولت کی میل غریبوں کو دیدیا کریں۔

لیکن

قرآن نے کہا کہ یہ جہانِ سعی و عمل ہے اس لئے یہاں تقدیر اور قسمت کا کوئی سوال نہیں۔ جس شخص کو جو کام دیا جائے وہ اسے پوری محنت سے کرے۔ جو شخص زیادہ کمانے کی صلاحیت رکھتا ہے وہ اپنی کمائی میں سے صرف اتنے کا حقدار ہے جس سے اس کی ضروریات پوری ہوں۔ باقی سب دوسروں کا حق ہے اس لئے کہ زیادہ کمانے کی صلاحیت ہم نے دی ہے اس لئے تمہارے معاشرے کا اصول یہ ہونا چاہئے کہ

کسی کی کوئی ضرورت رُکی نہ رہے، اور کسی کے پاس
ضرورت سے زیادہ نہ رہے۔

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مُرتّب	بدل اشتراک
دس آنے (پاکستانی)	محمد یونس	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
بارہ آنے (ہندوستانی)		غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ

جلد ۵	دسمبر ۱۹۵۲ء	نمبر ۱۲

فہرست مضامین

قرآن نے کیا کہا؟	۳
لمعات	۵ — ۱۱
طلوع اسلام کا نیا پروگرام	۱۲
سلیم کے نام (محترم پرویز صاحب)	۱۳ — ۲۸
مقامِ حدیث۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کی نظر میں	۲۹ — ۴۹
بے حجابی (نظم) (محترم اسد ملتانی)	۵۰
مثلہٗ معہٗ (علامہ تمنا عمادی)	۵۱ — ۶۸
نقد و نظر	۶۹ — ۷۰
۱۔ اسلام اور فطرت	
۲۔ حیات جمال الدین افغانی	
۳۔ روحِ قرآن اور سائنس	
۴۔ قطعات و رباعیات اکبر الہ آبادی	
۵۔ المسلمون	

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لمعات

آپ نے پرانے بادشاہوں یا ریاستوں کے قصے سنے ہوں گے، ان کے ہاں ایک خاص طبقہ ہوتا تھا جنہیں مصاحب کہا جاتا تھا۔ مصاحب کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ ہمیشہ اپنے آقا کی تعریف کرتا رہے، صبح سے شام تک اس کی مدح وستائش میں قصیدہ خواں رہے، اس کی کوئی کمزوری اس کے سامنے نہ آنے دے۔ اس کا کوئی عیب یا نقص اس سے بیان نہ کرے، اسے ہمیشہ معصوم اور منزہ عن الخطا ثابت کرے، وہ خواہ کاٹ کا اُلّو ہو لیکن مصاحب اس سے یہی کہے کہ حضور! دنیا میں اپ سے عقل آئی تھی۔ آدھی ساری دنیا کو ملی اور پوری ایک آپ کو عطا کی گئی۔ وہ خواہ کسی قسم کی طفلانہ حرکتیں کرے اس کی ہر حرکت پر سبحان اللہ اور ماشاء اللہ کے غلغلہ انداز نعرے بلند کئے جائیں۔ اس کی بیہودہ سے بیہودہ بات کو آسمان پر چڑھا دیا جائے اور یہ بات اس کے ذہن میں مسلسل اور پیہم بٹھا دی جائے کہ دنیا آج تک اس سے زیادہ صاحب عقل وشعور، مدبر، سلیقہ شعار، شریف، خلیق، بہادر، نیک اور عادل پیدا نہیں کر سکی۔ اس کی بٹیر کو شاہباز بنا کر دکھایا جائے اور اس کے مرغ کو عنقیم۔ ان کے متعلق اس قسم کی باتیں عام مشہور ہیں کہ آقا نے مصاحب سے کہا کہ "پینس کی سواری بھی کیا عجیب چیز ہے"۔ مصاحب نے فوراً جواب دیا کہ "کیا بات ہے حضور! کیا بات ہے حضور پینس کی سواری کی۔ بیٹھے جائیے، لیٹے جائیے، لکھتے جائیے، پڑھتے جائیے، پیٹ کا پانی نہیں چھلکتا"۔ اس نے کہا کہ "ذرا اتنی سی بات ہے کہ باگ پرائے ہاتھ ہوتی ہے"۔ جھٹ سے کہا کہ "لعنت بھیجئے سرکار! سواری کیا ہے چلتا جنازہ ہے۔ بس کلمہ پڑھنے کی دیر ہے"۔ یا مثلاً آقا نے کہا کہ "بیگن کی ترکاری بھی کیا عجیب ہے"۔ فوراً عرض کیا کہ "سبحان اللہ سرکار! بیگن کو تو حضرت آدم جنت سے اپنے ساتھ لائے تھے، خالی پکاؤ تو لذیذ، گوشت میں ڈالو تو لذیذ۔ ایک روٹی کھانی ہو چار روٹیاں کھانے کو جی چاہتا ہے۔ ترکاری کیا ہے ایک ٹانگ کا تیتر ہے"۔ اس نے کہا لیکن ذرا گرم اور خشک ہوتا ہے۔ فوراً جواب دیا کہ "لعنت بھیجئے سرکار! چالیس دن کھائے تو آدمی کوڑھی ہو جائے"۔ اگر آقا کی طبیعت ذرا مذہب پرست واقع ہوئی ہو تو مصاحب کے لئے میدان اور بھی وسیع ہو جاتا تھا۔ ہارون رشید ایک دن کبوتر اڑا رہا تھا کہ اتنے میں قاضی وہب آئے۔ ہارون نے پوچھا کہ کبوتر بازی کے متعلق کیا خیال ہے؟ اس نے فوراً جواب دیا کہ

> مجھ سے ہشام ابن عروہ نے یہ روایت بیان کی ہے کہ ہشام سے ان کے والد عُروہ روایت کرتے تھے کہ عائشہ صدیقہؓ نے ان سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلعم بھی کبوتر بازی فرماتے تھے۔

یہ تھی مصاحبت کی وہ (Institution) جس نے بادشاہوں کو برباد اور سلطنتوں کو تباہ کیا۔ مصاحبوں کا طبقہ بادشاہ کو اپنے زعم میں رکھتا

اور ملک و رعایا کے صحیح حالات ان تک کبھی پہنچنے نہ دیتا۔ رعایا بھوکوں مرتی لیکن مصاحب بادشاہوں سے یہی کہتے کہ "حضور! رعیت بڑی خوشحال ہے اور سرکار کی جان و مال کو دعائیں دے رہی ہے"۔ مملکت کی بنیادیں کھوکھلی ہوجاتیں لیکن وہ آخری وقت تک بادشاہ سے یہی کہتے رہتے کہ "حضور کی یہ سلطنت جو ہفتاد پشت سے ثریا بوس چلی آرہی ہے ابدالآباد تک قائم و دائم رہے گی۔ جو شخص اسکی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے گا اس کی آنکھ پھوڑ دی جائیگی۔ دشمن آپ کی ہیبت سے لرزہ براندام ہے۔ اس کے لشکر و سپاہ آپ کی تیغ ذوالفقار کے تصور سے نیم جاں ہوجاتے ہیں"۔ وہ اپنے آقاؤں کو اسی طرح بسم اللہ کے گنبد میں بند رکھتے تا آنکہ دشمن مملکت کے قریوں اور شہروں کو روندتا ہوا سر پر آپہنچتا اور شہنشاہ اور اس کی شہنشاہیت دونوں کا خاتمہ ہوجاتا۔

ہم ان قصوں کو پڑھتے ہیں اور یہ کہہ کر ہنس دیتے ہیں کہ یہ اگلے وقتوں کے لوگ بھی کیسے بیوقوف تھے۔ لیکن نہیں سوچتے کہ یہ باتیں اگلے وقت کے لوگوں کی نہیں ہیں بلکہ خود ہماری اپنی ہیں۔ آج بھی اسی قسم کے آقا موجود ہیں اور اسی قسم کے مصاحب۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب اس مصاحبت کا کام پریس (اخبارات) نے لیلیا ہے۔ روح وہی ہے صرف پیکروں کی تبدیلی ہوئی ہے۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں — اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

ان اخبارات کو اٹھا کر دیکھئے اور پھر سوچئے کہ ان میں اور ہنس کی سواری اور بینگن کی ترکاری والے مصاحبوں میں کوئی بھی فرق ہے؟ انکی کیفیت یہ ہے کہ کوئی اسکیم، کوئی تجویز، ارباب اقتدار کی طرف سے آئے۔ ابھی آدھا فقرہ ان کی زبان میں ہوگا کہ ان کی طرف سے سبحان اللہ اور مرحبا کا شور اس طرح بلند ہونا شروع ہوجائیگا جیسے شاعروں میں کسی استاد کے شاگرد اس کے آدھے مصرعہ پر تحسین و آفرین کا شور مچا دیتے ہیں۔ ان کی تقریروں کا ایک ایک فقرہ آسمان تک اچھالا جائے گا اور خواہ اس میں زبان تک کی غلطیاں بھی کیوں نہ ہوں انھیں وحی آسمانی کی طرح بے مثل و بے نظیر قرار دیا جائے گا۔ خواہ ساری دنیا انھیں گالیاں دے رہی ہو لیکن یہ انھیں ملت کا محبوب ترین لیڈر کہہ کر پکاریں گے۔ کہیں ان کا جلوس نکلے گا تو اس کے ساتھ خواہ بھرتی کے خدمت گذار اور حاشیہ بردار پا بجولاں، کشاں کشاں کیوں نہ جا رہے ہوں، ان کی رپورٹ سے معلوم ہوگا کہ از فرش تا عرش ملائکہ قطار در قطار ان کے جلوس میں چلے جا رہے تھے۔ کسی کانفرنس میں خواہ حاضرین نے انھیں تقریر کے لئے اٹھنے تک نہ دیا ہو، رپورٹ بتائے گی کہ دو لاکھ کے مجمع نے فلک بوس نعروں میں ان کا استقبال کیا اور اس سکوت سے ان کی تقریر سنی کہ گویا ان کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ افراد مملکت خواہ فاقوں مر رہے ہوں، ان اخبارات میں ارباب اقتدار کے حسن تدبر کی شان میں قصیدوں پر قصیدے لکھے جائیں گے۔ اگر ایک شخص اقتدار کی کرسی پر متمکن نہیں ہوا تو انھیں اس میں کوئی قابل ذکر خوبی دکھائی نہیں دیگی لیکن جونہی وہ سریرآرائے حکومت ہوا اور ان کی طرف سے شور اٹھا کہ ـــــ

آفتاب "تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا

ایک طرف ان کی مسلمہ قابلیتوں کے غلغلے بلند ہوں گے اور دوسری طرف ارباب حل و عقد کے اس حسن انتخاب کی داد دی جائے گی جب تک وہ برسر اقتدار رہے گا "سب تعریفیں" اس کے لئے مختص ہوں گی اور اگر ایسا ہوا کہ اس سے اقتدار کی کرسی چھین گئی تو دوسرے ہی دن اس کی ایک ایک برائی چن چن کر سامنے لائی جائے گی اور اس جنازہ خوانی کے بعد اسے پھر اسی لحد ـــ کے

خاموش گوشے میں سلا دیا جائیگا جہاں وہ پہلے پڑا تھا۔ ارباب اختیار کا ہر فیصلہ عدل نوشیروانی کو مات کرنے والا اور ان کا ہر عمل حاتم طائی کو شرمندہ کرنیوالا دکھایا جائیگا۔ پرائیویٹ سکریٹری ان اخبارات کے تراشے نہایت حسنِ تدبیر کے ساتھ کشتی میں رکھکر ہر صبح آقائے نعمت کے حضور پیش کرے گا اور اس طرح کوشش کی جائے گی کہ اس کی کوئی کمزوری اس پر کھلنے نہ پائے۔ وہ کبھی اپنے آپ پر تنقید نہ کر سکے وہ اپنے انتظامات کے اسقام و نقائص سے باخبر نہ ہونے پائے۔ اور اسے کبھی معلوم نہ ہو سکے کہ

کہتی ہے اس کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

اگر کوئی شخص (اپنی بدبختی سے) اتنا کہنے کی جرأت کر بیٹھا کہ فلاں معاملہ میں فلاں کمزوری نظر آتی ہے تو مصاحبوں کا یہ ٹولہ چاروں طرف سے قینچیاں ہاتھ میں لئے یورش کر کے آگے بڑھتا ہے کہ ایسا کہنے والے کی زبان کاٹ لی جائے، کوئی اسے غدار وطن قرار دیتا ہے اور کوئی اسلام کا دشمن۔ اس کے خلاف یوں ہنگامہ آرائی کی جاتی ہے اور آقائے نعمت کو یہ کہکر پھر فریب نفس میں مبتلا کر دیا جاتا ہے کہ آپ ان باتوں کی قطعاً پرواہ نہ کیجئے۔ آپ ملت کی آنکھ کا تارا ہیں اور پوری کی پوری قوم آپ کے قدموں پر جان قربان کرنے کے لئے سربکف منتظر حکم کھڑی ہے۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہی مصاحب ہیں جن کی وجہ سے افراد تباہ ہوتے ہیں اور قومیں ڈوبتی ہیں۔ اس کی اصطلاح میں مصاحب کا نام قَرِیْنٌ (جمع قرناء) ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ قرناء کرتے یہ ہیں کہ

فَزَیَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ (۴۱/۲۵)

ان کے آگے اور پیچھے ہر شئے کو حسین اور مزین بنا کر پیش کرتے ہیں۔

اور اس طرح وہ قوم اسی طرح تباہ و برباد ہو جاتی ہے جس طرح ان سے پہلے وہ قومیں برباد ہو گئیں جنھیں ان کے مصاحبوں نے فریب نفس میں مبتلا رکھا۔

وَحَقَّ عَلَیْهِمُ الْقَوْلُ فِیْ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ (۴۱/۲۵)

اور ان کے حق میں خدا کا قانون اسی طرح پورا ہو جاتا ہے جس طرح ان سے پہلی قوموں کے حق میں ہوا۔

ان مصاحبین (قُرَنَاء) کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان لوگوں کے سامنے ایسے جاذب نگاہ پردے لٹکائے جائیں جن سے صحیح راستہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے اور وہ غلط راستے پر چلتے رہیں لیکن انھیں قدم قدم پر باور یہی کرایا جائے کہ وہ بالکل صحیح راہ پر چل رہے ہیں۔

وَاِنَّهُمْ لَیَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ وَیَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ (۴۳/۳۷)

وہ انھیں صحیح راستے سے روکتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم بالکل صحیح راستہ پر چل رہے ہیں

جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں ان مصاحبوں کی رفاقت صرف اس وقت تک ہوتی ہے جب تک یہ شخص اقتدار و اختیار کی کرسی پر متمکن رہے۔ جونہی اس پر کوئی گردش آئے وہ اس سے فوراً الگ ہو جاتے ہیں اور اس کے تمام جرائم سے اپنے آپ کو اس طرح بری الذمہ قرار دے لیتے ہیں گویا انھیں اس سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ سورۂ قٓ میں ہے کہ جب اس قسم کا آقائے نعمت سزا میں ماخوذ ہوتا ہے۔ تو

قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ (۵۰/۲۷)

اس کا مصاحب جھٹ سے کہہ دیتا ہے کہ اے میرے پروردگار! میں نے اسے سرکش نہیں بنایا تھا یہ تو خود ہی غلط راہوں پر اتنی دور نکل گیا تھا۔

یہی مصاحب جو پہلے اس کے ہر گناہ کو ثواب اور ہر لغزش کو حسن عمل کہہ کر پکارا کرتے تھے کہنا شروع کر دیں گے کہ ہم نے اس سے کبھی نہیں کہا کہ اس قسم کی غلط روش اختیار کرو۔ ہم ہمیشہ خود بھی قانون وضوابط کے پابند رہے ہیں اور اسے بھی اسکی پابندی کی تاکید کرتے رہتے تھے۔

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۵۹/۱۶)

شیطان کی طرح کہ وہ پہلے انسان سے کہتا ہے کہ خدا کے قانون سے انکار کرو۔ اور جب وہ ایسا کرتا ہے تو پھر کہہ دیتا ہے کہ میں تو اس سے بے تعلق ہوں۔ میں تو ہمیشہ خدائے رب العالمین سے ڈرتا رہتا ہوں۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب ارباب اقتدار کو اس طرح پیہم فریب میں رکھنے سے قوموں پر تباہی آتی ہے تو اسوقت ان مصاحبوں کا یہ کہنا کہ ان کے جرائم کے ہم ذمہ دار نہیں انھیں اس تباہی سے نہیں بچا سکتا۔ آقا اور اس کے مصاحب دونوں ہلاکت کے جہنم میں جھونک دیئے جاتے ہیں۔

فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خٰلِدَيْنِ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الظّٰلِمِيْنَ (۵۹/۱۷)

سو ان دونوں کا انجام یہ ہوگا کہ وہ ہلاکت کی آگ میں ڈال دیئے جائیں گے اور جو اندھیرے میں رہے اور دوسروں کو اندھیرے میں رکھے ان کا یہی حشر ہوا کرتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ اتنے بیوقوف نہیں ہوتے کہ وہ دیکھ نہ سکیں کہ یہ مصاحبین انھیں کس طرح دھوکہ میں رکھ رہے ہیں لیکن اسکے باوجود وہ فریب نفس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جلسہ میں لوگوں نے ہماری تقریر نہیں سُنی لیکن جب دوسری صبح اخبار کی یہ رپورٹ ان کے سامنے آتی ہے کہ جلسہ گاہ میں فتنہ پردازوں کی ایک جماعت گھس آئی تھی جو دشمنانِ ملت کے ایجنٹ تھے اور انھوں نے ہنگامہ برپا کرنے کی کوشش کی تو یہ بھی اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں کہ قوم ہم سے ناخوش نہیں یہ صرف دشمنوں کی سازش ہے جو اس قسم کے مظاہرے کراتے رہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن اس کی شہادت دیتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ عاد و ثمود تباہ ہوئے اسلئے کہ (زین لھم الشیطٰن اعمالھم) شیطان نے ان کے اعمال ان کے سامنے نہایت خوشنما شکل میں پیش کئے ہیں (فصدھم عن السبیل) اور اس طرح سیدھی راہ ان کی نگاہوں سے اوجھل کر دی (وکانوا مستبصرین ۲۹/۳۸) حالانکہ وہ صحیح راہ کو دیکھنے کی بصیرت رکھتے تھے۔

لیکن اس کا احساس انھیں اس وقت ہوتا ہے جب انکی ناعاقبت اندیشیوں کے نتائج مرتب ہو کر انھیں اور ان کے ساتھ پوری کی پوری قوم کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ وہ اسوقت تباہیوں اور بربادیوں کے اس سیلاب بلا انگیز کو دیکھتا ہے اور نہایت حسرت سے کہتا ہے:۔

يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا

اے کاش میں نے اس مصاحب کو اپنا رفیق نہ بنایا ہوتا کیونکہ اس نے مجھے راہِ راست سے بھٹکا دیا۔

لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَاۗءَنِيْ (۲۵/۲۸-۲۹)

قانون اور ضابطہ تو میرے پاس آ چکا تھا لیکن اس کمبخت نے مجھے بہکا دیا۔

آقا اپنے مصاحبوں کو مورد الزام قرار دیتا ہے کہ ان کمبختوں نے حقیقت حال کو میرے سامنے بے نقاب نہ ہونے دیا اور مجھے ہمیشہ دھوکہ میں رکھا ورنہ میں ایسا کیوں کرتا جس سے قوم کی قوم پر ایسی تباہی آجاتی۔ مصاحب آقا کو مجرم قرار دیتے ہیں کہ یہ جانتا بوجھتا سب کچھ کر رہا تھا ہم بھلا اسے کس طرح اس راستہ پر چلنے کی تلقین کرتے جو اس پر اور اس کے ساتھ ہم پر اور اتنا ہی نہیں بلکہ ساری کی ساری قوم پر اس طرح بربادی کا سیلاب لے آتا۔ وہ اسے الزام دیتے ہیں اور وہ انھیں ملزم ٹھہراتا ہے لیکن قرآن ان دونوں سے ایک قدم آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ مجرم نہ تنہا وہ ہے اور نہ یہ، مجرم درحقیقت پوری کی پوری قوم ہے جس نے دیدہ و دانستہ قوانین خداوندی کو پس پشت ڈال رکھا تھا۔

وقال الرسول یٰرب ان قومی اتخذوا ھٰذا القرآن مھجورا۔ (۲۵/۳۰)

خدا کا پیغامبر یہ کہے گا کہ اے میرے پروردگار اصل بات یہ ہے کہ اس قوم نے قرآن کو ترک کر رکھا تھا۔

اگر یہ قوم ضابطۂ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتی تو نہ ہی ان مصاحبین کی مجال تھی کہ اہل حل و عقد کو اس طرح فریب میں مبتلا رکھتے اور نہ ہی ان اربابِ اقتدار کو اس کی جرأت ہوتی کہ وہ اس طرح فریب نفس میں مبتلا ہو جاتے۔ اس وقت قوم کا ہر فرد ارباب اقتدار کی ہر نقل و حرکت کا محاسب ہوتا اور جونہی اس کا کوئی قدم قرآن کے راستے سے اِدھر اُدھر ہونے لگتا چاروں طرف سے خبردار اور ہوشیار کی آواز آتی۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ جب حضرت عمرؓ شام کے سفر سے واپس آرہے تھے تو ایک جنگل میں شب بسری کیلئے ڈیرہ ڈالا۔ حضرت عمرؓ اپنے معمول کے مطابق باہر نکلے کہ اگر یہاں مملکت کے کوئی افراد بستے ہیں تو معلوم کریں کہ ان کی حالت کیا ہے۔ دیکھا کہ ایک جھونپڑی میں ایک بڑھیا بیٹھی ہوئی ہے پوچھا کہ تمہارا کیا حال ہے؟ اس نے کہا کہ حال کیا بتاؤں۔ جب سے نیا خلیفہ آیا ہے کسی نے پوچھا ہی نہیں کہ ہم پر کیا گذر رہی ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کیا تم نے اپنی پریشانی کی اطلاع خلیفہ تک پہنچائی ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں حضرت عمرؓ نے کہا کہ پھر خلیفہ کے لئے کس طرح ممکن ہے کہ وہ ایک ایک فرد کے حالات سے باخبر رہے اور اس کی تکلیفوں کا ازالہ کر سکے۔ بڑھیا نے کہا کہ اگر عمرؓ میں اس کی صلاحیت نہ تھی تو وہ خلیفہ کیوں بن گیا عمرؓ آبدیدہ واپس آگئے اس کے بعد حضرت عمرؓ ساری عمر اس واقعہ کو دہرایا کرتے تھے اور ہمیشہ اشک آلود آنکھوں سے کہا کرتے تھے کہ عمرؓ کو اس بڑھیا نے بتایا کہ خلافت اور بادشاہت میں کیا فرق ہے۔

جب تک ارباب حل و عقد حضرت عمرؓ کی طرح راتوں کو بھیس بدل بدل کر اپنی آنکھوں سے یہ نہیں دیکھیں گے کہ قوم کی حالت کیا ہے اور اپنے کانوں سے نہیں سنیں گے کہ ——— کہتی ہے ان کو خلق خدا غائبانہ کیا ——— اور جب تک قوم کا ہر فرد اس بڑھیا جیسی جرأت اپنے اندر نہیں رکھے گا کہ وہ اربابِ حل و عقد کو بتا سکے کہ خلافت اور بادشاہت میں کیا فرق ہے۔ اسوقت تک مصاحبین اربابِ اختیار کو برابر فریب میں مبتلا رکھیں گے اور ارباب اختیار دیکھتے بوجھتے برابر فریب کھاتے چلے جائیں گے۔ اسلئے کہ فریب میں بڑی لذت ہوتی ہے اور حقائق کا سامنا کرنے کیلئے بڑے بلند کیرکٹر کی ضرورت ہے۔

ہم نے سابقہ اشاعت میں لکھا تھا کہ محترم وزیر اعظم کے اعلان کے مطابق مجلس آئین ساز کی بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ ۲۲ نومبر کو اسمبلی میں پیش کی جائے گی۔ چنانچہ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم اس رپورٹ پر اپنی تنقید دسمبر کے پرچہ میں شائع کر دیں خواہ اس کیلئے پرچہ

کی اشاعت میں کچھ دنوں کی تاخیر ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ وہ رپورٹ ابھی پیش نہیں کی جائے گی اس لئے اس کے متعلق اشاعت رواں میں کچھ نہیں لکھا جا سکتا۔ اس ضمن میں البتہ دو ایک چیزیں ایسی سامنے آئیں جن کا تذکرہ اس وقت ضروری ہے۔

نومبر کے تیسرے ہفتہ میں ملک کے مختلف حصوں کے مولوی صاحبان کراچی میں جمع ہوئے۔ معلوم ہوا کہ یہ حضرات محترم وزیر اعظم کی دعوت پر تشریف لائے ہیں کیونکہ وہاں سے مذکورہ بالا رپورٹ کے سلسلہ میں کچھ بات چیت کرنا چاہتے تھے۔ اس سے ہمارے اس خدشہ کی تائید ہو گئی جس کا اظہار ہم گذشتہ اشاعتوں میں کرتے چلے آرہے ہیں، یعنی حکومت اس ہنگامہ سے مرعوب ہو چکی ہے جو آجکل ملک میں نظامِ شریعت کے نام پر برپا کیا جا رہا ہے اور اس لئے چاہتی ہے کہ مولوی صاحبان سے مفاہمت کر لی جائے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی صورت پیدا کی جائیگی کہ یا تو علماء حضرات کا ایک الگ محکمہ قائم کر دیا جائے اور یا ان کی مشاورت کی مجالس، مجالسِ مقننہ کے ساتھ قائم کر دی جائیں اور شرعی امور میں ان سے استصواب کیا جائے۔ کوئی شکل بھی ہو حکومت اس اصول کو تسلیم کر لے گی کہ شریعت کا علم مولوی صاحبان کی اجارہ داری ہے اور برہمنوں کے اس طبقہ کے باہر نہ کوئی قرآن سمجھ سکتا ہے اور نہ اس سے فقہی استنباط کر سکتا ہے۔ یہ وہ ذہنیت ہے جو اس زمانہ میں پیدا ہوئی جب اسلام میں دین اور سیاست کی ثنویت پیدا ہوئی۔ سیاسی امور اربابِ حکومت کے سپرد کئے گئے اور مذہبی امور علماء کے حصہ میں آگئے۔ یعنی وہی تقسیم جو عیسائیت میں خدا اور قیصر سے تعبیر کی جاتی تھی اور ہندوستان میں کھشتری اور برہمن کے دانوں کی تقسیم سے۔ ہماری ہزار سالہ تباہیوں کا راز اسی تقسیم میں ہے۔

طلوع اسلام مسلسل پانچ برس سے اس خطرہ کا اعلان کرتا چلا آرہا ہے لیکن اب اسے نظر آرہا ہے کہ پاکستان اس خطرہ سے بچ نہیں سکتا۔ ہماری بدقسمتی سے ہمارے اربابِ حل وعقد میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں جو نگاہوں میں اتنی بصیرت رکھے کہ اسے یہ خطرہ صاف صاف نظر آجائے اور اس کے بعد اس میں اتنی جرأت اور ہمت ہو کہ وہ ہنگامہ خیزیوں اور غوغا آرائیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ملک کو اس تباہی سے بچا لے۔ اگر یہاں بھی اقتدار مولوی کے ہاتھ میں دیدیا گیا تو چند سال کے عرصہ میں پاکستان اسی سطح پر آجائیگا جہاں اسوقت (ترکی کو چھوڑ کر) دیگر ممالک اسلامیہ ہیں۔ ہم ملک کے ہوشمند طبقہ سے اپیل کرینگے کہ وہ کوشش کرے کہ پاکستان اس تباہی سے بچ جائے۔ اسلامی دستور کا بنیادی اصول یہ ہے کہ قرآن کریم کے محکم اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہم اپنے قوانین آپ وضع کریں۔ اس کیلئے نہ تو کسی خاص گروہ کی ضرورت ہے اور نہ ہی ان کے ان روایاتی قوانین کی جو سینکڑوں برس پہلے کے زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق مدون ہوئے اور جو کسی صورت میں بھی ہمارے زمانے کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ یہ لوگ اس طرح حکومت کیلئے ایک مستقل مصیبت بن جائیں گے۔ اس کا اندازہ ایک چھوٹی سی مثال سے لگائیے۔ اسلامی جماعت نے جو اپنا مطالبہ پیش کیا ہے اس میں ایک شق یہ بھی ہے کہ حکومت تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کے بہم پہنچانے کی ذمہ دار ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے اور اسی صورت میں پوری ہو سکتی ہے جب وسائل پیداوار (Means of Production) خود حکومت کے ہاتھ میں ہوں۔ اگر افراد کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی ذمہ داری حکومت پر ہو اور وسائل پیداوار لوگوں کی ذاتی ملکیت میں ہوں تو سوچئے کہ حکومت اپنی اس ذمہ داری سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔ اسلامی جماعت نے حکومت سے یہ مطالبہ کر دیا کہ افراد کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانا ان کے ذمہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی دوسری طرف یہ فتویٰ بھی دیدیا کہ وسائل پیداوار افراد کی ذاتی ملکیت میں رہیں گے اور اس پر کوئی حد بندی عائد نہیں کی جا سکے گی۔ آپ غور کیجئے کہ

جس حکومت کے سامنے یہ دونوں چیزیں بطور احکام شریعت پیش کی جائیں گی اس حکومت کا حشر کیا ہوگا۔ ذاتی ملکیتوں کا تو آج بھی یہ نتیجہ ہے کہ اس پانچ سال کے عرصہ میں چند لاکھ مہاجرین کیلئے مکانات کا انتظام نہیں ہو سکا اور ذاتی ملکیت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ پاکستان جیسا ملک غلّہ تک کیلئے دوسروں کا محتاج ہو گیا۔ ہمارے ارباب شریعت ذاتی املاک کو تو چھونے نہیں دیں گے کیونکہ یہ ان کی شریعت کے خلاف ہے لیکن حکومت سے برابر مطالبہ کئے جائیں گے کہ وہ تمام افراد مملکت کے لئے مکانات بھی فراہم کرے اور ان کی روٹی کا انتظام بھی کرے۔ بہرحال اس وقت پاکستان میں نظام شریعت کی آڑ میں جو کھیل کھیلا جا رہا ہے اور جس طرح خدا اور رسول کے نام پر عوام کو اپنے پیچھے لگایا جا رہا ہے یہ ایک اتنے بڑے خطرہ کا آغاز ہے جس کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ اگر ملک کا کوئی ہوشمند طبقہ پاکستان کو اس تباہی سے بچانے کیلئے آمادہ ہو سکے تو خیر ورنہ یہ چیز ہمارے موجودہ اربابِ حل و عقد کے تو بس کی نہیں۔ ملک کو ضرورت ہے ایک مصطفےٰ کمال کی جس کے ہاتھ میں قرآن، سر میں عقل، جگر میں ہمت اور بازوؤں میں قوت ہو۔

ہم آخر میں پھر دہرائے دیتے ہیں کہ ایک اسلامی مملکت کے دستور کا حدود اربعہ یہ ہے کہ

(۱) ملت کے نمائندگان، قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق اپنے لئے قانون آپ وضع کریں۔ قرآن کے اصول غیر متبدل رہیں گے اور ان جزئی قوانین میں حسب ضرورت تغیر و تبدل ہوتا رہے گا۔

(۲) ایک اسلامی مملکت کا وجود اسلئے عمل میں آتا ہے کہ وہ ایک ایسا معاشرہ قائم کرے جس میں نہ صرف تمام افراد معاشرہ کی طبعی ضروریاتِ زندگی ہی پوری ہوں بلکہ ان افراد کی مضمر صلاحیتوں کے کامل طور پر نشو و نما پانے کے سامان بھی میسر ہوں۔

(۳) اس اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کیلئے ضروری ہے کہ ملک کے تمام وسائل پیداوار انفرادی ملکیت کی بجائے مملکت کی تحویل میں ہوں تاکہ رزق کی تقسیم ضروریات کے اعتبار سے یکساں طور پر ہو سکے۔

(۴) اس معاشرہ کا آغاز پاکستان کی سرزمین سے ہو اور پھر اسے آگے بڑھاتے بڑھاتے تمام نوع انسانی تک پہنچا دیا جائے۔

یہ ہے اسلام کا منشا۔ اس سے پاکستان بچ سکتا ہے اور اسی میں نوعِ انسانی کی نجات کا راز پوشیدہ ہے۔ اگر ملک کا ہوشمند طبقہ پاکستان کو بچانا چاہتا ہے تو اس کیلئے کرنے کا کام یہی ہے کہ وہ منظم طور پر کوشش کرے کہ پاکستان کا دستور مندرجہ بالا حدود اربعہ کے مطابق مرتب ہو۔ ان امور کی تفاصیل طلوع اسلام میں ایک عرصہ سے بیان ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ ہم نے بغرض سہولت انھیں دو چھوٹی چھوٹی کتابوں میں جمع کر دیا ہے۔ ایک کا نام ہے "اسلامی نظام" اور دوسری کا نام ہے "قرآنی دستور پاکستان" یہ کتابیں اس کوشش میں کافی راہنمائی کر سکتی ہیں۔

"قرآنی دستور" میں قرارداد مقاصد اور دستور کے وہ مسوّدات بھی شامل ہیں جنھیں طلوع اسلام نے خالص قرآن کی روشنی میں مرتب کر کے حکومت کے پاس بھیجا تھا۔

طلوعِ اسلام کا نیا پروگرام

قرآنی فکر کو عام کرنے اور اسے زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچانے کیلئے طلوع اسلام نے اپنا نیا پروگرام شروع کر دیا ہے۔

اس پروگرام کا اولین قدم یہ ہے کہ طلوع اسلام کے لٹریچر کو چھوٹی چھوٹی کتابوں کی شکل میں شائع کر کے ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دیا جائے۔ اس کام کو تکمیل تک پہنچا دینا آپ حضرات کی توجہ اور کوشش کا متقاضی ہے۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ آپ اپنے شہر کے کتب فروشوں اور اپنے ایسے احباب کو اس کے لئے تیار کریں جو ان کتابوں کو فروخت کریں۔ اس کے لئے انھیں ۳۳⅓ فی صدی کمیشن دیا جائے گا۔ شرط اس قدر ہوگی کہ ان حضرات کو کتابیں مطلوبہ تعداد میں وی پی بھیجی جائیں گی اور دو ماہ کے بعد جس قدر کتابیں ان کے پاس باقی بچ جائیں گی، ادارہ انھیں واپس لے لیگا۔ کاروباری نقطۂ نگاہ سے ضروری ہے کہ ادارہ کے پاس خود ان حضرات کی طرف سے تحریری آرڈر آئیں، ان کی طرف سے کسی اور کا لکھ دینا کافی نہیں ہوگا۔ نیز جو کتابیں واپس کی جائیں ان کے متعلق بھی یہ احتیاط ضروری ہے کہ وہ خراب حالت میں نہ ہوں۔

چونکہ اس وقت تدوین دستور کا مسئلہ پیش پیش ہے اسلئے سب سے پہلے "اسلامی نظام" اور "قرآنی دستور پاکستان" کی الگ الگ کتابیں شائع کی گئی ہیں۔ ان کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی ضرورت ہے۔

ان کے علاوہ محترم پرویز صاحب کا انقلاب آفریں مقالہ "اسباب زوال امت" الگ کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے علاوہ بریں ایک کتاب "قتل مرتد، غلام اور لونڈیاں، اور یتیم پوتے کی وراثت" پر مشتمل ہے۔ علاوہ بریں حسب ذیل کتابوں کی کتابت ہو رہی ہے۔

(۱) سلیم کے نام خطوط

(۲) محترم پرویز صاحب کے مضامین کا مجموعہ "فردوس گم گشتہ"

(۳) مقام حدیث

(۴) زندگی کے مختلف مسائل کے متعلق "قرآن کیا کہتا ہے"۔

ان کے بعد رفتہ رفتہ اور کتابیں بھی شائع ہوتی رہیں گی۔

واللہ المستعان۔

سلیم کے نام....

(قرآنی نظام ربوبیت)

پرویز

قرآنی نظامِ ربوبیت اور اشتراکی نظام میں فرق

غنیمت ہے سلیم! تمہاری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ قرآنی نظامِ ربوبیت، اشتراکی نظام سے بہتر ہی نہیں بلکہ کہیں آگے ہے۔ لیکن اس کی دلیل صرف وہی نہیں جو تم نے لکھی ہے کہ

> اشتراکی نظام صرف روٹی کے مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے اور قرآنی نظام ربوبیت روٹی کے مسئلہ کے حل کے بعد، ہر ابنِ آدم کی مضمر صلاحیتوں کے کامل طور پر نشوونما پانے کا سامان بھی بہم پہنچاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عملی نتیجہ کے لحاظ سے ان دونوں نظاموں میں یہ فرق بھی بہت اہم ہے۔ یعنی قرآنی نظامِ ربوبیت وہ سب کچھ بھی دیتا ہے جس کا دعویٰ اشتراکی نظام کرتا ہے اور اس کے بعد انسانی معاشرہ کو اس سے کہیں آگے لے جاتا ہے۔ لیکن ان دونوں نظاموں میں ایک اور اہم فرق یہ ہے کہ اشتراکی نظام کسی مضبوط بنیاد پر قائم نہیں اور قرآنی نظام ربوبیت ایسی محکم بنیادوں پر قائم ہے "لا انفصام لھا" جو کبھی منہدم نہیں ہو سکتیں۔

تمام انسانوں میں مساوات کیوں؟

میں نے پہلے بھی لکھا تھا اور اُسے آج پھر دہراتا ہوں کہ مارکس یا مارکسٹ اس کا جواب دے ہی نہیں سکتا کہ غریبوں کی مدد کیوں کی جائے؟ کیوں تمام انسانوں میں مساوات پیدا کی جائے؟ وہ شخص جو بہت زیادہ کماتا ہے اپنی محنت کا ماحصل اس شخص کو کیوں دیدے جو کمانے کے قابل نہیں؟ اس کا جواب صرف ایک ہی ہو سکتا تھا کہ کمزوروں کی مدد کرنا انسان کا "اخلاقی فریضہ" ہے۔ لیکن جس نظریۂ زندگی میں اخلاق (MORALS) کا تصور ہی نہ ہو اس میں ان امور کا جواب کیا مل سکتا ہے؟

اس کیوں کا جواب اسلام ہی دے سکتا ہے

میں اس سے پہلے ایک خط میں لکھ چکا ہوں کہ "کیوں" کا جواب صرف وہی شخص دے سکتا ہے جو قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین رکھتا ہو اور یہ مانتا ہو کہ زندگی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اخلاقیات کی ساری عمارت انہی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے اور جو فلسفہ ان بنیادوں ہی سے انکار کر دے اس میں اس سوال کا جواب کیسے مل سکتا ہے؟

یہ اس سوال کا ایک پہلو تھا۔ اب دوسرا پہلو دیکھو۔

پہلے یہ سمجھ لو سلیم! کہ اخلاق کہتے کسے ہیں؟ ہم کہتے ہیں کہ "سچ بولنا بہرحال اچھا ہے"۔ یعنی حالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں، سچ بولنا بہرحیث و بہرکیف اچھا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے . . کہ سچ کی قیمت حالات کے اعتبار سے اضافی (RELATIVE) نہیں۔ بلکہ اس کی قیمت اس کی ذات کے اندر (INTRINSIC) ہے جو ہر حالت میں قائم رہتی ہے۔ اسے مستقل قدر (PERMANENT VALUE) کہتے ہیں۔ اس تصور کا نام اخلاقیات ہے۔ اس کے برعکس ایک شخص کہتا ہے کہ سچ اور جھوٹ اپنی ذاتی قیمت کچھ نہیں رکھتے۔ ہر شے حالات کے تحت بدلتی رہتی ہے۔ اگر حالات ایسے ہیں کہ ان میں سچ بولنا فائدہ مند ہے تو سچ بولنا چاہئے اگر حالات بدل جائیں اور سچ بولنے میں نقصان ہو تو جھوٹ بولنا چاہئے۔ یہ دوسرا تصور حیات ہے جس میں کوئی شے مستقل قدر نہیں رکھتی۔

اشتراکیت میں کوئی تصور حیات مستقل قدر نہیں رکھتا

مارکس (MARX) کے نزدیک، دنیا میں کوئی نظریہ، کوئی تصور حیات، مستقل قدر نہیں رکھتا وہ بھی افلاطون اور ہیگل کے تتبع میں یہی مانتا ہے کہ کائنات کی ہر شے تغیر پذیر ہے لیکن یہ تغیر ایک خاص تسلسل کے مطابق واقع ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک نظام قائم ہوتا ہے اس کے بعد زمانے کی رَو اُس نظام کو اُلٹ کر، اس کی جگہ ایک دوسرا نظام مسلط کر دیتی ہے جو پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ اس کی اصطلاح میں زمانے کی اس رو کا نام تاریخی وجوب (Historical Necessity) ہے۔ یعنی تاریخ کی اندھی قوت جو ہمیشہ اس نظام کو الٹ دیتی ہے جو موجود (PRESENT) ہو اور اس کی جگہ اس کی ضد، دوسرا نظام لے آتی ہے۔ اس نظریہ کے ماتحت، مارکس نے کہا کہ یورپ کا موجودہ سرمایہ دارانہ نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ تاریخی وجوب اس نظام کی بساط کو الٹ کر، اس کی جگہ ایک ایسا نظام مسلط کریگی جو اس کی ضد ہوگا۔ یعنی محنت کشوں کا اشتراکی نظام۔ اس میں نہ کسی جذبے کا داخل ہے نہ عقیدے کا۔ نہ ہی اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت ہے نہ وجہ جواز تلاش کرنے کی حاجت۔ تاریخی وجوب کا تقاضا ہے کہ ایسا ہو کر رہے۔ انسان کی کوئی قوت اسے روک نہیں سکتی۔

تاریخی وجوب کا ڈرامہ

تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ مارکس کے نظریہ کے ماتحت، یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام اچھا ہے یا بُرا۔ اُسے علیٰ حالہٖ رکھنا چاہئے یا بدلنا چاہئے۔ نہ ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نظام کے برعکس محنت کشوں (مزدوروں اور کسانوں) کے اشتراکی نظام میں کیا خوبیاں ہیں۔ وہ نوع انسانی کے لئے اچھا ہے یا برا۔ اس کے نظریے کے ماتحت ہر موجودہ نظام الٹ کر رہے گا، خواہ وہ اچھا ہو یا برا۔ اور اس کی جگہ دوسرا نظام آئیگا (جو پہلے نظام کی ضد ہوگا) خواہ وہ نظام نوع انسانی کے لئے اچھا ہو یا برا۔ اس کے بعد یہ آنے والا نظام بھی ایک دن اسی طرح الٹ جائیگا جس طرح موجودہ نظام الٹ رہا ہے۔ خواہ وہ نظام نوع انسانی کیلئے کتنا ہی مفید کیوں نہ ہو۔ تاریخی وجوب کے نزدیک "اچھا اور برا" سب یکساں ہے۔ پھر جس طرح آج انسانوں کی کوئی قوت اس پر قادر نہیں کہ آنے والے انقلاب کو روک کر، موجودہ نظام کو برقرار رکھ سکے، اسی طرح جب (اپنے وقت پر) اشتراکی نظام کے الٹنے کا وقت آئے گا تو انسان کی کوئی قوت اس انقلاب کو بھی نہیں روک سکے گی۔ مارکس کے نظریے

مجبور تماشائی

کے مطابق زمانے کی رو کے مقابلے میں انسان بے بس و مجبور ہے۔ اس نظریہ کو "تاریخی جبر" . . . . . .

(HISTORICAL DETERMINISM) کہتے ہیں۔

تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ مارکس کے نظریہ کے مطابق، کسی نظام کے اچھے یا برے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اسلئے کسی اخلاقی قدر کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ کائنات کے اسٹیج پر تاریخی وجوب ایک ڈرامہ کھیل رہی ہے جسے انسان ایک مجبور تماشائی کی حیثیت سے دیکھ رہا ہے۔ اس ڈرامے کا موجودہ سین یہ ہے کہ نظام سرمایہ داری کی بساط الٹ کر (اسکی ضد) اشتراکی نظام کو مسلط کر دیا جائے۔ "مجبور تماشائی" اس سین کو بھی چپ چاپ بیٹھا دیکھ رہا ہے۔ اس کے بعد دوسرا سین آئیگا جس میں تاریخی وجوب کا عفریت، اشتراکی نظام کو الٹ کر اس کی جگہ (اس کا ضد) سرمایہ دارانہ نظام، پھر سے لے آئیگا۔ "مجبور تماشائی" اس سین کو دیکھنے پر بھی مجبور ہوگا۔ اسلئے مارکس کے نظریے کے مطابق یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اشتراکی نظام سرمایہ دارانہ نظام سے بہتر ہے یا نہیں۔ جب صورت حال یہ ہے تو پھر اشتراکی نظام

اشتراکی نظام کے حق میں اخلاقی جواز کا سوال ہی نہیں

کے حق میں اخلاقی جواز تلاش کرنے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے (عصر حاضر کا مشہور اشتراکی) (L. LAURAT) اپنی کتاب (MARXISM AND DEMOCRACY) میں ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:۔

مارکس اور انجلز نے اشتراکی آرزوؤں کی بنیاد، تمدنی ترقی کے معاشی قانون پر رکھی۔ ایسا کرنے میں انھوں نے اپنی اشتراکی آرزوؤں کا جواز اخلاقی بنیادوں پر نہیں رکھا۔ بلکہ یہ کیا کہ اشتراکیت، تاریخی وجوب کا تقاضا ہے۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت تمہارے سامنے آگئی ہوگی کہ مارکس یا مارکسٹ کیوں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کہ سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ اشتراکی نظام کیوں قائم کرنا چاہیئے؟ "کیوں" کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں انسان صاحب اختیار و ارادہ ہو۔ لیکن جس فلسفہ کی رو سے انسان مجبور محض ہو اور کوئی خارجی قوت (اسے تاریخی وجوب کہہ لیجئے یا کچھ اور) از خود ایک نظام کو مٹا دے اور اس کی جگہ دوسرا نظام لے آئے۔ اس میں "کیوں" کی گنجائش کہاں ہے؟

آرزوؤں پر اشتراکی نظام کی تعمیر ہوئی تھی

مسٹر (LAURAT) کا جو اقتباس اوپر دیا گیا ہے اس سے ایک تو یہ مزید واضح ہو گیا کہ مارکس اور انجلز نے اپنے معاشی نظریہ کی بنیاد اخلاقیات پر نہیں رکھی بلکہ اسے "تاریخی وجوب" کا لازمی نتیجہ قرار دیا ہے لیکن یہ اقتباس اس سے الگ ایک اور اہم حقیقت کی بھی غمازی کر رہا ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے (اور یاد رکھو کہ کہنے والا ایک ممتاز اشتراکی ہے) کہ مارکس اور انجلز کے دل میں اشتراکی نظام کی آرزوئیں مچل رہی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ اشتراکی نظام قائم ہو جائے لیکن انھیں اس نظام کے جواز (Justification) کے لئے اخلاقی بنیادیں نہیں ملتی تھیں۔ اسلئے انھوں نے اسکی بنیاد "تاریخی وجوب" کے نظریہ پر رکھدی۔

غریبوں سے کام لینے کی یہی صورت ہے کہ ان کو محتاج رکھا جائے

میرا بھی یہی خیال ہے سلیم! کہ مارکس اپنے سینے میں ایک دردمند دل رکھتا تھا جو غریبوں کی مصیبت پر کڑھتا اور کمزوروں کی حالت دیکھ کر دکھتا تھا۔ اس کے زمانے میں یورپ کے سرمایہ دارانہ نظام نے مزدوروں اور غریبوں کی جو حالت کر رکھی تھی اس کے پیش نظر

اس قسم کے دلِ دردمند میں جوشِ انتقام کا موجزن ہو جانا مستبعد نہیں تھا۔ (DEFOE) نے ۱۷۰۴ء میں ایک پمفلٹ شائع کیا تھا جس میں لکھا تھا کہ اگر غریبوں کی مدد کی گئی تو وہ سہل انگار ہو جائیں گے۔ اور اگر انھیں سرکاری اداروں میں کام پر لگایا گیا تو اس کا اثر پرائیویٹ کارخانہ داروں پر پڑیگا۔ اسلئے انھیں ان کی حالت پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ وہ اپنا رزق آپ تلاش کریں اور کام نہ ملنے کی صورت میں فاقہ کشی کریں[1]۔ اس کے کچھ عرصہ بعد (Mandevillee) نے اپنی مشہور کتاب (Fable of the Bees) شائع کی تھی جس کا ملخص یہ تھا کہ

غریبوں سے کام لینے کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ انھیں محتاج رکھا جائے۔ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی ضروریات کو تھوڑا تھوڑا پورا کیا جائے۔ انھیں ضروریاتِ زندگی کی طرف سے بے نیاز کر دینا حماقت ہے۔ سوسائٹی کی خوشحالی کا راز اسی میں ہے کہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد تباہ حال اور غریب رہے۔

بھوک کا کوڑا وحشی سے وحشی جانور کو رام کر دیتا ہے

اٹھارویں صدی کے اخیر میں، برطانیہ میں یہ سوال پیدا ہوا کہ دیہاتی آبادی کو کس طرح مجبور کیا جائے کہ وہ شہروں میں آکر کارخانوں میں مزدوری کریں۔ اس باب میں (WILLIAM TOWNSEND) نے (۱۷۸۵ء میں) اپنی کتاب (DISSERTATION ON THE POOR LAWS) میں لکھا کہ

بھوک کا کوڑا ایسا سخت ہے جو وحشی سے وحشی اور تند سے تند جانور کو بھی رام کر دیتا ہے۔ اس سے سرکش سے سرکش انسان مطیع و فرمانبردار بن جاتا ہے۔ اسلئے اگر تم غریبوں سے کام لینا چاہتے ہو تو اس کا ذریعہ فقط ایک ہے۔ یعنی بھوک۔ بھوک ہی وہ جذبۂ محرکہ ہے جس سے غریب اور محتاج ہر قسم کا کام کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔

غریبوں کی زبوں حالی کی ذمہ دار عیسائیت کی تعلیم ہے

یہ تھی، وہ فضا جس میں مارکس نے آنکھ کھولی۔ ایسے حالات میں غریبوں اور مزدوروں کی امداد کیلئے عام طور پر لوگوں کے اخلاقی جذبات ہی کو اپیل کیا جاتا ہے لیکن جب مارکس نے صورتِ حال کا گہری نظر سے جائزہ لیا تو اس نے دیکھا کہ غریبوں اور کمزوروں کی اس حالت کا ذمہ دار ہی وہ ضابطۂ اخلاق ہے جو یورپ میں رائج تھا۔ اس ضابطۂ اخلاق کی عمارت عیسائیت کی ان بنیادوں پر استوار تھی جن کی رو سے دنیا کی بادشاہت امیروں کے لئے تھی اور غریبوں کے حصے میں "آسمان کی بادشاہت" آئی تھی۔ اس ضابطۂ اخلاق میں غریبوں کو یہ سکھایا جاتا تھا کہ اگر کوئی زبردست ہاتھ ان کا کوٹ اتار لے، تو انھیں چاہیئے کہ اپنی واسکٹ خود اتار کر اسے دیدیں۔ اُن سے کہا جاتا تھا کہ اگر چور اُن کا اتنا زیادہ مال باندھ لے جو اس سے اٹھ نہ سکے تو چاہیئے کہ وہ خود گٹھڑی اٹھا کر اس کے گھر چھوڑ آئیں۔ لہٰذا اس ضابطۂ اخلاق کے رُو سے امیروں اور بالادستوں سے کس طرح کہا جاتا کہ وہ غریبوں کو موقعہ دیں کہ وہ ابھر کر امیروں کی سطح پر آجائیں! حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ BRIFFAULT نے لکھا ہے) گذشتہ دو ہزار سال میں غریبوں اور مظلوموں پر

[1] دیکھو (E.H. Carr) کی کتاب "The New Society"

جسقدر انسانیت سوز مظالم ہوئے ہیں، ان کی ذمہ دار عیسائیت کی تعلیم ہے۔ یہی وجہ تھی کہ نیٹشے کو اس عیسائیت کے "خون سے اپنے ہاتھ رنگنے پڑے اور اسے اصلی معنوں میں صلیب دینا پڑا"۔ یہی وہ تعلیم تھی جس نے یورپ میں مذہب کے خلاف جذباتِ منافرت و انتقام کو مشتعل کر دیا اور پھر اس آگ کے شعلے ساری دنیا میں پھیل گئے۔ اگر مارکس ایسے مذہب کو "غریبوں کیلئے افیون" نہ کہتا تو کیا کرتا؟ (اور ایک عیسائیت ہی پر کیا موقوف ہے سلیم! ساری دنیا کے مذاہب جو درحقیقت انسانی ذہن کے وضع کردہ ہیں لیکن ان کی نسبت آسمانی کتابوں اور خدا کے فرستادوں کی طرف کر دی گئی ہے اسی ذہنیت کے علمبردار ہیں۔ اسی زمرے میں مسلمانوں کا موجودہ مذہب بھی شامل ہے۔ جو ان کے دور ملوکیت کا پیدا کردہ اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کا حامل ہے وہ دین نہیں جو قرآن میں ہے۔ بلکہ مسلمانوں کا مروجہ مذہب!)

یہ تھے وہ حالات جن کے ماتحت، مارکس کے لئے مشکل (ہی نہیں بلکہ) ناممکن تھا کہ وہ اپنی "اشتراکی آرزوؤں" کو اخلاقی بنیادوں پر مشہود کرتا۔ اس مشکل کے پیش نظر اُسے اخلاقیات کو چھوڑ کر دوسرے سہارے تلاش کرنے پڑے۔ چونکہ اس کی ذہنی افتاد فلسفیانہ اور مورخانہ واقعہ ہوئی تھی اسلئے اس نے اس کیلئے فلسفہ اور تاریخ کو سہارا بنایا اور تاریخ کا ایک نیا فلسفہ وضع کیا اور اس کا نام "تاریخی وجوب" رکھا۔ لیکن (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) یہ سہارا بڑا کمزور ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ یہ سہارا سہارا ہی نہیں۔

اشتراکی نظام افراد کیلئے جذبۂ محرکہ کو مہیا نہیں کرتا

اشتراکیت کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ عائد کیا جاتا ہے کہ جب تمام افراد کی ضروریات زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری معاشرہ اپنے سر پر لے لے اور اس طرح افراد معاشرہ اپنی ضروریات کی طرف سے مطمئن ہو جائیں تو وہ کونسا جذبۂ محرکہ (INCENTIVE) ہوگا جس کی رو سے یہ افراد کام کرنے پر آمادہ کئے جا سکیں گے۔ نہ صرف کام کرنے پر بلکہ زیادہ سے زیادہ محنت کرنے اور معاشرہ کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق کام کرنے پر آمادہ اور اس کے بعد اپنی محنت کے ماحصل کو دوسروں کی بہبود میں صرف کرنے کے لئے تیار (اور بہ طیب خاطر تیار) کئے جا سکیں۔ یہ ہے وہ بنیادی سوال جس کا جواب مارکس یا مارکسزم کے پاس کچھ نہیں۔ نہ ہی ہو سکتا ہے اور یہی ہے وہ بنیادی فرق جو قرآنی نظام ربوبیت کو اشتراکی نظام سے بہت بلند لے جاتا ہے اسلئے کہ (Prof: HAWTREY) کے الفاظ میں:

> جو چیز ایک معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظام سے متمیز کرتی ہے یہ ہے کہ اس نظام میں وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جو لوگوں کو کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ (Quoted by Carr)

قرآنی نقطۂ نگاہ سے ہر نظریہ فنا پذیر نہیں

تم دیکھ چکے ہو سلیم! کہ مارکس کے نظریہ "تاریخی وجوب" کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ کائنات میں کوئی تصور کوئی نظریہ، کوئی نظام باقی نہیں رہ سکتا۔ ہر نظریہ تغیر پذیر اور ہر نظام فنا آمادہ ہے اور یہ سلسلۂ تغیرات مسلسل چلا جا رہا ہے۔ اس کے برعکس، قرآن یہ تصور پیش کرتا ہے کہ بعض نظریاتِ زندگی ایسے ہیں جن میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور بعض ایسے جو اپنی ذات میں باقی رہنے کی استعداد اور جوہر رکھتے ہیں (یمحوا اللہ ما یشاء ویثبت) اور یہ تغیر و ثبات (فنا اور بقا) ایک خاص قانون کے مطابق ہوتا ہے، جس کی اصل و بنیاد اس تغیر پذیر مادی کائنات سے ماورا ہے (وعندہٗ

ام الکتاب ۱۳/۳۹) اس قانونِ "محو و ثبات" (فنا و بقا) کی تفصیل تو طول و طویل ہے لیکن قرآن نے ان تمام تفاصیل کو ایک بنیادی نقطہ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یاد رکھو

واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (۱۳/۱۷)

دنیا میں بقا اس تصور یا نظام کے لئے ہے جو نوعِ انسانی کے لئے نفع بخش ہو۔

یہ ہے وہ بنیادی قانون جس کے مطابق، نظریاتِ زندگی اور نظاہائے حیات کی فنا اور بقا کے فیصلے ہوتے ہیں۔ باقی وہ رہتا ہے جو نوعِ انسانی کیلئے منفعت بخش ہو۔ جو ایسا نہ ہو مٹ جاتا ہے۔

"ما ینفع الناس" کے الفاظ پر غور کرو سلیم! بس اس میں سارے مسئلہ کا حل پوشیدہ ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں ہر شخص اپنے اپنے نفع کے لئے کام کرتا ہے۔ یہی وہ جذبۂ محرکہ ہے جو اُسے کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ کوئی شخص ایسا کام نہیں کرنا چاہتا جس میں اسے اپنا فائدہ دکھائی نہ دے۔

ہر شخص کا اپنا فائدہ ——— یہ ہے عام اصول۔

وہی نظام باقی رہ سکتا ہے جس میں نوعِ انسانی کا فائدہ ہو

لیکن قرآن نے کہا ہے کہ بقا اس نظریہ یا نظام کے لئے ہے جس میں "نوعِ انسانی کا فائدہ" ہو۔ اسلئے قرآنی قانون کی رُو سے،

(i) وہ نظام جس میں ہر شخص کے پیشِ نظر اپنا ذاتی فائدہ ہو، باقی رہنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس

(ii) وہ نظام جس میں ہر شخص کے پیشِ نظر "نوعِ انسانی کا فائدہ" (ما ینفع الناس) ہو، باقی رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

متاعِ دنیا اور متاعِ آخرت کی قرآنی اصطلاح

قرآن یہ کہتا ہے کہ دوسری قسم کے نظام میں بھی "ہر فرد کا ذاتی فائدہ" موجود ہوتا ہے لیکن یہ فائدہ فوراً، براہ راست (IMMEDIATELY) سامنے نہیں آتا بلکہ بالواسطہ (INDIRECTLY) ذرا آگے چل کر (IN THE LONG RUN) سامنے آتا ہے۔ اس کے برعکس، پہلی قسم کے نظام میں ہر شخص اپنا ذاتی فائدہ فوراً سامنے دیکھ لیتا ہے۔ اسے مفادِ عاجلہ (فوراً سامنے آجانے والا نفع) کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ نفع پیش پا افتادہ (قریب تر) ہوتا ہے اس لئے اس کے لئے قرآن نے متاع الدنیا (قریبی منافع) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس کے برعکس جو فائدہ افراد تک پوری نوعِ انسانی کے اندر گردش کرتا ہوا پہنچتا ہے اسے مآلِ کار، آخر الامر یا مستقبل کا فائدہ کہا گیا ہے جس کے لئے قرآن میں آخرۃ (مستقبل) کی اصطلاح آئی ہے۔ بالفاظِ دیگر، ذاتی منفعت، سود و خویش یا انفرادی زندگی کو "حیوۃ الدنیا" کہا گیا ہے اور کلی منفعت، سود و بہبود یا نوعِ انسانی کی اجتماعی زندگی کے لئے (جس میں موت کے بعد زندگی کا تصور بھی شامل ہے) "حیوۃ الآخرۃ" کی اصطلاح اختیار کی گئی ہے۔ قرآن کے نزدیک ذاتی منفعت کی انفرادی زندگی کا نظریہ غلط ہے اور کلی مفاد کی اجتماعی زندگی کا نظریہ صحیح اس حقیقت کو قرآن ایک "اندھے عقیدے" کے طور پر نہیں منواتا (وہ کسی دعوے کو کبھی اندھے عقیدے کے طور پر پیش نہیں کرتا۔ ہر دعوے

انسانی سطح کی زندگی حیوانی سطح سے بلند ہونی چاہیئے

کے لئے دلیل لاتا ہے) وہ کہتا ہے کہ اگر تمہاری زندگی حیوانی سطح (ANIMAL LEVEL) پر ہوتی تو پھر یہ تصور درست تھا کہ ہر فرد اپنا اپنا منافع دیکھتا۔ کسی کو کسی دوسرے سے کچھ واسطہ نہ ہوتا۔ جس طرح ایک حیوان کو کسی دوسرے حیوان سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ (ان الذین کفروا یتمتعون ویاکلون کما تاکل الانعام۔۔۔) لیکن زندگی کی انسانی سطح (HUMAN LEVEL) میں زندگی کے تقاضے حیوانی سطح سے مختلف ہوجاتے ہیں۔ اس میں زندگی صرف طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) نہیں ہوتی بلکہ اس سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ طبیعی زندگی کا تعلق انسانی جسم سے ہے جو قوانینِ طبیعی (PHYSICAL LAWS) کے مطابق ہر آن تغیر پذیر ہوتا رہتا ہے۔ برعکس اس کے

انسانی جسم کے علاوہ کچھ اور بھی ہے

انسان میں "کچھ اور" بھی ہے جو ان تمام تغیرات میں غیر متغیر رہتا ہے۔ اس کا نام انسانی ذات (Personality) یا خودی (self) یا انا (IAMNESS) یا الغو (Ego) ہے۔ قرآن میں اس کے لئے "روحِ خداوندی" کی اصطلاح آئی ہے۔ یعنی انائے مطلق (Absolute Ego) کی قوت۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کے لئے، جسمانی پرورش کے ساتھ ساتھ، اس ذات یا انا کی تربیت (Development) نہایت ضروری ہے کیونکہ زندگی طبعی زندگی کا نام نہیں۔ طبعی زندگی کا خاتمہ موت کے ساتھ ہوجاتا ہے لیکن انسانی زندگی کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ انسانی جسم کی پرورش تو مفاد عاجلہ (متاع الدنیا) کی انفرادی زندگی سے ہوجاتی ہے لیکن انسانی ذات کی نشوونما کا رشتہ نوعِ انسانی کی نشوونما کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسلئے اس کے لئے پوری نوعِ انسانی کے مفاد کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جسمانی پرورش

طبیعی زندگی کا انحصار "لینے" (TO RECEIVE) پر ہے مگر انسانی زندگی کی پرورش دینے سے ہوتی ہے

(حیوانی سطح زندگی) "لینے" سے ہوتی ہے (کوئی حیوان کسی دوسرے حیوان کو کچھ نہیں دیتا) اس کے برعکس انسانی زندگی کی پرورش "دینے" (TO GIVE) سے ہوتی ہے۔ جس خلاق فطرت نے جسمانی زندگی کے لئے وہ قاعدہ مقرر کیا ہے اسی نے انسانی زندگی کے لئے یہ آئین مقرر کر رکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دونوں زندگیاں بالکل نمایاں اور ایک دوسرے سے متمیز ہیں۔ اور ان کے نتائج بالکل واضح۔ دیکھو، سورۂ واللیل میں اس حقیقت کو کس قدر بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے جب فرمایا کہ ان سعیکم لشتی۔ تمہاری کوششیں مختلف سمتوں میں جاتی ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو یاد رکھو کہ فاما من اعطیٰ واتقیٰ۔ جس نے "دینا" سیکھا اور اس طرح اپنی زندگی کو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ کرلیا۔ وصدق بالحسنیٰ۔ اور معاشرے میں توازن پیدا کرکے اس حقیقت کو سچ کر دکھایا۔ فنیسرہ للیسریٰ۔ تو اس کے لئے نشوونما کی راہیں آسان ہوگئیں۔ اس کے برعکس، واما من بخل۔ جس نے صرف "لینا" سیکھا اور سب کچھ خود اپنے ذاتی مفاد کے لئے سمیٹ لیا۔ واستغنیٰ اور سمجھ لیا کہ یہی کچھ میری پرورش کے لئے کافی ہے۔ مجھے اس کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ نہ معاشرہ کی نہ دیگر افراد انسانیہ کی۔ وکذب بالحسنیٰ اور اس طرح معاشرے کے توازن کو بگاڑ دیا۔ فسنیسرہ للعسریٰ۔ سو اس کے لئے نشوونما کی راہیں مسدود ہوگئیں۔ لیکن یہ اس کی بھول ہے اس نے سمجھا ہی نہیں کہ انسانی زندگی کیا ہے اور اس کی نشوونما کے لئے کیا قانون مقرر ہے۔

اس کے سامنے یہ حقیقت اس وقت نمایاں ہو گی جب اس کی یہ روش معاشرہ میں انقلاب پیدا کر دیگی اور اس وقت وہ دیکھے گا کہ اس کا جمع کردہ مال اس کے کسی کام نہیں آیا۔ (وما یغنی عنہ مالہ اذا تردّٰی) اس نے یہ روش اس لئے اختیار کی تھی کہ اس نے سمجھا کہ وہ زندگی کی نشوونما کے لئے خود ہی قاعدے مقرر کر سکتا ہے۔ لیکن اس نے اس حقیقت کو بھلا دیا کہ اس کی زندگی کی نشوونما کے لئے خود ہی قاعدے مقرر نہیں کئے جا سکتے۔ ان قواعد و قوانین کا سرچشمہ وہی ہے جو خود زندگی کا سرچشمہ ہے۔ (ان علینا للھدٰی) اس لئے کہ عقل انسانی کے پیش نظر فقط فرد متعلقہ کے مفاد (یعنی مفاد عاجلہ) کی نگہداشت ہوتی ہے اور قانون خداوندی کے سامنے مفادِ عاجلہ اور مستقبل کے مفاد دونوں ہوتے ہیں۔ (وان لنا للاٰخرۃ والاولٰی) خدا کا قانون انسان کو اس انداز زندگی کی ہلاکت سامانیوں سے متنبہ کرتا ہے جو انسانی زندگی کی برومندیوں کو جھلسا دیتی ہے (فانذرتکم نارًا تلظّٰی)۔ اس تباہی اور ہلاکت کا شکار وہ لوگ ہوتے ہیں جو انفرادی زندگی (الگ الگ رہنے اور ذاتی مفاد پیش نظر رکھنے کی زندگی) کو نصب العین حیات بنا لیتے (لا یصلٰھا الا الاشقی) یعنی وہ لوگ جو معاشرہ کے توازن کو بگاڑ کر اپنے دعوے انسانیت کی عملی تکذیب کرتے ہیں اور اس طرح صحیح راہ حیات سے گریز کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ (الذی کذب وتولّٰی) اس ہلاکت سے وہ لوگ بچ سکتے ہیں جو اپنی زندگی کو قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ رکھتے ہیں (وسیجنبھا الاتقی) یعنی وہ لوگ جو "دینا" سیکھتے ہیں اور اس طرح اپنی اور تمام نوع انسانی کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ (الذی یؤتی مالہ یتزکّٰی)۔

انسانی نشوونما کا راز دینے میں ہے

ان آیاتِ کبریٰ سے یہ حقیقت تمہارے سامنے آگئی ہو گی سلیم! کہ قرآن کی رو سے، انسانی زندگی کی نشوونما کا راز "دینے" میں ہے۔ (EINSTEIN) کے الفاظ میں:

انسان کی قدر و قیمت کا معیار یہ ہے کہ وہ کسقدر "دیتا ہے"۔ نہ یہ کہ اس میں "لینے" کی استعداد کس قدر ہے۔

(Out of My Later Days P. 35)

"دینا" اور "آخرت" کا یہ مفہوم اس سے پہلے بھی تمہارے سامنے آچکا ہے۔ میں نے اسے دہرایا اس لئے ہے کہ یہ حقیقت بڑی لطیف لیکن اس کے ساتھ ہی بڑی اہم ہے اور جب تک اسے اچھی طرح ذہن نشین نہ کر لیا جائے قرآن کے متعلقہ مباحث سمجھ میں نہیں آسکتے۔ اس مفہوم کو سامنے رکھو اور پھر سورۂ حدید کی ان آیات کو دیکھو جن کے سمجھنے میں تمہیں دشواری پیش آرہی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اعلموا انما الحیٰوۃ الدنیا لعب ولھو۔ یہ نظریہ حیات کہ زندگی فقط مفادِ عاجلہ حاصل کرنے کا نام ہے، کیا ہے؟ یہ لعب ہے۔ لعب کے عام معنی تو کھیل تماشے کے ہیں لیکن اس کا اطلاق ایسی کوشش پر ہوتا ہے جس میں حرکت (Movement) تو ہو لیکن وہ حرکت انسان کو منزلِ مقصود تک نہ پہنچائے۔ اسی لئے کہتے ہیں لعب بنا الموج۔ دریا کی لہریں ہم سے کھیلتی رہیں، یعنی انہوں نے ہماری کشتی کو حرکت میں تو رکھا لیکن ساحلِ مقصود کی طرف بڑھنے نہ دیا۔ اور لھو کہتے ہیں ہر اُس جاذبیت کو جو انسان کو اپنی طرف متوجہ کر لے اور اس طرح اسے اس کام سے غافل کر دے جو اس کے پیش نظر تھا۔ (جس طرح تمہارے چھوٹے نوکر "عبدو" کی طالت ہے

یہ نظریۂ حیات کہ زندگی فقط مفادِ عاجلہ حاصل کرنے کا نام ہے لعب ہے

اسے دہی لینے کے لئے بھیجو تو راستے میں بندر یا کا تماشا دیکھنے میں ایسا محو ہوتا ہے کہ دہی لانا تو ایک طرف کٹورہ بھی گم کر دیتا ہے) لہٰذا صرف ذاتی مفاد کا نظریۂ زندگی ایسا ہے جس میں حرکت اور کوشش تو ضرور ہوتی ہے لیکن وہ اسے منزلِ مقصود کی طرف نہیں جانے دیتی۔ کیونکہ منزلِ مقصود تھی انسانی زندگی کی نشوونما اور یہ صرف جسمانی پرورش ہی میں الجھ کر رہ گیا۔ مفاد عاجلہ (یعنی منفعتِ خویش کا نظریہ) اپنے اندر ایسی کشش وجذب (لھو وزینۃ) رکھتا ہے کہ انسان کی نگاہوں سے اس کی انسانی زندگی کا نصب العین اوجھل ہو جاتا ہے۔ (لعب ولھو)۔ اس منفعت خویش کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ وتفاخر بینکم۔ باہمی تفاخر۔ فخر، گائے یا بکری کے ایسے باکھ (udder) کو کہتے ہیں جو دیکھنے میں بہت بڑا نظر آئے لیکن اس میں دودھ بہت کم ہو۔ لہٰذا محض جسمانی زندگی میں باہمی تفاخر کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی حیاتِ خارجی (جسمانی پرورش کے ساز وسامان) تو بہت بڑے دکھائی دیں لیکن حیاتِ داخلی (جوہر انسانیت) بہت کم ہو۔ وتکاثر فی الاموال والاولاد۔ اس زندگی کا مقصد فقط اس قدر ہوتا ہے کہ انسان چاہتا ہے کہ دولت اور قوت میں دوسروں سے بڑھ جائے۔

مفاد عاجلہ کی زندگی کی حقیقت متاعِ فریب سے زیادہ نہیں

یہ ہے مفاد عاجلہ کی زندگی کی حقیقت۔ اس کی مثال اس بارش کی سی ہے (کمثل غیث) جو اس قسم کی سبزی پیدا کرے جو ایک ہی چھینٹے سے اُگ آتی ہے۔ اس قسم کی سبزی کی جڑیں اوپر ہی اوپر ہوتی ہیں، نیچے نہیں جاتیں۔ اس سے کسان خوش تو ہو جاتا ہے، (اعجب الکفار نباتہ) لیکن ذرا دھوپ پڑی اور وہ خشک ہوئی اور زرد پڑ گئی اور دو ہی دن میں چورا چورا ہو کر بکھر گئی (ثم یھیج فتراہ مصفرا ثم یکون حطاما) اس قسم کی کھیتی کی زندگی دو چار دن کی ہوتی ہے اور اس لئے اس کی خوشی بھی ایسی ہی ناپائیدار۔ آخر کار اس کا نتیجہ افسردگی اور پژمردگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا (وفی الاخرۃ عذاب شدید) اس مایوسی اور افسردگی سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی کوششوں کو قانون خداوندی سے ہم آہنگ کرے اور اس طرح اس نظام کی محافظت میں آجائے جو اس قانون کی رو سے متشکل ہوتا ہے (ورضوان من اللہ ومغفرۃ)

مذکورہ بالا امثال سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ مفاد عاجلہ کی زندگی متاع فریب کے سوا کچھ نہیں (وما الحیوۃ الدنیا الا متاع الغرور) (غرور، اس باکھ کو کہتے ہیں جو دکھائی تو بڑا دے لیکن دودھ سے خالی ہو)

باہمی منافست کے جذبہ کیلئے دوسرا میدان ہے

اس کے بعد ارشاد ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ باہمی منافست کا جذبہ انسان کے اندر موجود ہے۔ ہم اس جذبہ کو کچلنا نہیں چاہتے البتہ اس کے لئے میدان دوسرا تجویز کرتے ہیں۔ تم مسابقت کرنا چاہتے ہو تو مسابقت کرو اس نظام کے قیام میں جو خدا کے قانونِ ربوبیت کی رو سے عمل میں آتا ہے اور جس میں انسانی زندگی ان تمام ہلاکتوں اور تباہیوں سے محفوظ رہتی ہے جو مفاد عاجلہ کی ذہنیت کا لازمی نتیجہ ہے۔ (سابقوا الی مغفرۃ من ربکم) اس نظام کا نتیجہ خوشگواریوں کی ایسی جنت ہوتا ہے جو زمان ومکان کی حدود سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے۔ اور ساری کائنات کو محیط ہوتی ہے (وجنۃ عرضھا کعرض السماء والارض) اور یہ نتیجہ ہوتا ہے اس نصب العین حیات کا جسے انسان وحی خداوندی کے مطابق اپنے لئے متعین کرتا ہے (اعدت للذین آمنوا باللہ ورسلہ) اس قسم کی خوشگواریاں اور کامرانیاں کسی خاص گروہ یا افراد تک محدود

نہیں ہوتیں بلکہ ہر اس جماعت کے حصہ میں آسکتی ہیں جو انھیں حاصل کرنا چاہے یعنی اپنے اندر ان کے حصول کی صلاحیت پیدا کرلے ــــ (ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم)

کم استعداد لوگ بھی محروم نہیں رکھے جاسکتے

اوپر کہا گیا ہے کہ یہ معاشی خوش حالیاں اسے مل سکتی ہیں جس میں ان کے حاصل کرنے کی صلاحیت یا استعداد ہو۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص میں کسی داخلی یا خارجی حادثہ کی وجہ سے اس استعداد میں کمی واقعہ ہوجائے یا وہ بالکل ہی سلب ہوجائے (مثلاً بعض پیدائشی کمزوریاں یا بعض بیماریوں کے عواقب یا باہر کی دنیا کے حادثات) تو کیا ایسی صورت میں وہ شخص ان خوش حالیوں سے محروم رہ جائے گا؟۔ بالکل نہیں۔ خدا کے قانونِ ربوبیت میں اس قسم کے حوادث کے لئے پہلے ہی سے (Provision) کردی گئی ہے اسلئے کہ ایسے معاشرہ میں جس میں ہر فرد کا نصب العین حیات دوسروں کی ربوبیت (نشوونما) ہو اس قسم کی (Provision) از خود موجود ہوتی ہے۔ ما اصاب من مصيبة في الارض ولا في انفسكم الا في كتاب من قبل ان نبرأها۔ ان ذلك على الله يسير)

اس معاشرہ میں اس قسم کے حوادث، انسان کو سامانِ نشوونما سے محروم نہیں رکھتے اسلئے کہ اس میں جن افراد کو زیادہ استعداد میسر ہوتی ہے وہ اسے اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر اس کے ماحصل کو اپنے ہی تک محدود نہیں رکھتے (لكيلا تأسوا على ما فاتكم ولا تفرحوا بما اتاكم) اس قسم کی دشواریاں تو اس معاشرہ میں پیش آتی ہیں جہاں ہر شخص دوسرے کی گھات میں اس طرح رہتا ہے جس طرح شکاری چپکے چپکے دبے پاؤں شکار کی طرف جاتا ہے اور اسے پکڑ کر بہت خوش ہوتا ہے۔ (والله لا يحب كل مختال فخور) اس قسم کے "شکاری"

گریز کی راہیں نکالنے والے قانونِ خداوندی کو متاثر نہیں کرسکتے

معاشرہ میں اربابِ حل وعقد کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ سب کچھ اپنے لئے سمیٹنے کی فکر کرتے رہتے ہیں اور اس خیال سے کہ لوگ ان کی اس روش پر گرفت نہ کرسکیں ایسے قوانین وضع کردیتے ہیں جن سے اس قسم کی انفرادی مفاد پرستیاں "قانوناً" جائز قرار پاجائیں۔ (ان الذين يبخلون ويأمرون الناس بالبخل) یہ لوگ قانونِ ربوبیت سے علانیہ سرکشی کی جرأت تو نہیں کرپاتے البتہ اس قسم کی قانون سازیوں سے اپنے لئے گریز کی راہیں نکالتے رہتے ہیں۔ ان گریز کی راہیں نکالنے والوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس سے خدا کا قانون ذرا بھی اثر پذیر نہیں ہوتا۔ وہ ان باتوں سے بے نیاز ہے۔ اور یہی اس کے قابل ستائش ہونے کی دلیل ہے۔ (ومن يتول فان الله هو الغني الحميد)۔

صحیح معاشرہ قائم کرنے کیلئے رسول بھیجے گئے

اس قسم کے معاشرہ کے قیام کے لئے انتظام یہ کیا گیا تھا کہ خدا کے فرستادہ، اس نظام کے اصول وضوابط لیکر آئیں جن کے ذریعے انسانی معاشرہ میں توازن قائم رہے (لقد ارسلنا رسلنا بالبينت وانزلنا معهم الكتاب والميزان ليكون الناس بالقسط)

انفرادی مفاد پرستوں کیلئے شمشیر خارا شگاف نازل کی گئی

لیکن اللہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ انفرادی مفاد کی فکر میں غلطاں وپیچاں رہنے والے گروہ محض وعظ ونصیحت سے ایسا معاشرہ قائم نہیں

ہونے دینگے اس لئے اس نے نوعِ انسانی کی نفع بخشی کیلئے ضوابط قانون کے ساتھ شمشیر خارا شگاف بھی نازل کی ۔ (وانزلنا الحدید فیہ باس شدید ومنافع للناس)

لیکن اس نظام کے قیام کے لئے سب سے مقدم ضرورت اس جماعت کی ہے جو مفاد عاجلہ کی جاذبیتوں سے صرف نظر کرکے اس نظام کے اَن دیکھے نتائج پر ایمان رکھے اور اسے اس کا یقینِ محکم ہو کہ یہ نظام اپنے اندر اتنی قوت رکھتا ہے جس سے یہ مخالفت کی تمام قوتوں پر غالب آکر رہے گا۔ ولیعلمنّ اللہ من ینصرہ ورسلہ بالغیب ان اللہ قوی عزیز (۵۷/۲۵)

وہی نظام قائم رہ سکتا ہے جو نوع انسانی کیلئے سود مند ہو

تم نے دیکھا سلیم! کہ یہ دونوں معاشرے کس طرح نکل کر الگ الگ ہوجاتے ہیں۔ ایک معاشرہ وہ جو اس نظریہ پر قائم کیا گیا ہو کہ اس کا وجود نوعِ انسانی کی منفعت (ربوبیت عامہ) کے لئے ہے اور دوسرا معاشرہ وہ جو "بخل" کے تصور پر قائم ہوتا ہے۔ بخل کے معنی یہ ہیں کہ کوئی فرد یا گروہ یا قوم سب کچھ اپنے مفاد کے لئے سمیٹ لے اور اسے دوسروں کی منفعت کیلئے عام نہ ہونے دے (اسے Arrested Interests کا معاشرہ کہئے اس سے بخل کے معنی واضح ہوجاتے ہیں) قرآن نے مختلف مقامات پر واضح الفاظ میں بتا دیا کہ جو نظام اس نظریہ پر قائم ہوگا وہ باقی نہیں رہ سکتا اس کی جگہ ایسا نظام لے لیگا جو اس کے مخالف نظریہ پر قائم ہوگا۔ یعنی نوع انسانی کی منفعت کے لئے۔ اس کے لئے بخل کے مقابلے میں "انفاق" کی اصطلاح آتی ہے جسے (Open Interests) کا معاشرہ سمجھنا چاہئے۔ اس سے انفاق کے معنی واضح ہوجاتے ہیں یعنی وہ میانی جس کے دونوں سرے کھلے ہوں۔ سورۂ محمدؐ میں ہے کہ "تمہارا نصب العین حیات یہ ہونا چاہئے کہ تم اپنی محنتوں کا ماحصل نوع انسانی کی منفعت کیلئے صرف کرو۔ (ھا انتم ھؤلاء تُدعَون لتنفقوا فی سبیل اللہ) لیکن تمہاری یہ کیفیت ہے کہ تم اس کے برعکس سب کچھ اپنی ذات کے لئے سمیٹنے لگ جاتے ہو (فمنکم من یبخل) تم بزعم خویش یہ سمجھتے ہو کہ تم

اگر تم بخل کروگے تو اجتماعی حیثیت سے مٹ جاؤگے اور کوئی دوسری قوم تمہاری جگہ لے لیگی

اس طرح دوسرے انسانوں کو سامانِ نشوونما سے محروم کردوگے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس اندازِ نگاہ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم خود ہی اس سے محروم رہ جاؤگے (ومن یبخل فانما یبخل عن نفسہ) جو معاشرہ قانونِ خداوندی کے مطابق قائم ہوتا ہے وہ اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ تم سے کچھ نہیں مانگتا۔ البتہ تم اپنی نشوونما کے لئے اس کے محتاج ہوتے ہو۔ (واللہ الغنی وانتم الفقراء) اب یہ دونوں راہیں تمہارے سامنے ہیں۔ اگر تم بخل والا معاشرہ قائم کروگے تو اسے بقا نصیب نہیں ہوسکتی۔ اس لئے تم اجتماعی حیثیت سے مٹ جاؤگے۔ تمہاری جگہ ایک ایسی قوم آجائے گی جو تمہاری جیسی ذہنیت نہیں رکھے گی اور اس کے ہاتھوں وہ نظام قائم ہوجائے گا جو نوع انسانی کی ربوبیت کا ذمہ دار ہوگا۔ (وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم ۴۷/۳۸) یعنی خدا کا یہ اٹل قانون ہے کہ بقا اسی نظام کے حصہ میں آسکتی ہے جس کا مطمح نگاہ نوع انسانی کی منفعت ہو (واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض ۱۳/۱۷)

قرآنی معاشرہ صفت رب العلمینی کا مظہر ہوتا ہے

میں نے تمہیں اپنے سابقہ خط میں بتایا تھا کہ خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ جو معاشرہ اس کے قوانین کے مطابق قائم ہو اسے صفاتِ خداوندی کا مظہر ہونا چاہیئے۔ قرآن اس ضابطہ کا نام ہے جس کے مطابق یہ معاشرہ قائم ہوتا ہے۔ اس ضابطہ کی ابتداء ہی اس محکم اصول سے ہوتی ہے جس پر اس معاشرہ کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے وہ ... بنیادی اصول ہے الحمد للہ رب العالمین جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں وہی معاشرہ مستحق تعریف و ستائش ہوگا جو رب العالمینی (تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت) کے محکم اصول پر قائم کیا جائے گا۔ اس نظام کو قائم کرنے والوں کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اس سے ان پر کچھ تنگی ہی کیوں نہ آجائے (یؤثرون علیٰ انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ) اسلئے کہ وہ جانتے ہیں کہ انسانی ذات کی نشوونما کا راز ہی اس میں پوشیدہ ہے۔ ومن یوق شح نفسہ فاولئک ھم المفلحون ۵۹/۹ شح کے لفظ پر غور کرو، انفرادی مفاد پر مبنی معاشرہ کی پوری تصویر سامنے آجائے گی۔

بخل و انفاق کی ذہنیتوں میں فرق

ذرا سامنے لاؤ اس منظر کو کہ گرمی کی شدت ہے۔ کسی ایک جگہ تھوڑا سا پانی ہے اور اس کے اردگرد پیاسوں کا ہجوم لیکن میں ہر پیاسے کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو دھکیل کر پیچھے ہٹا دے اور خود آگے بڑھ کر پانی پی لے۔ اس قسم کے منظر کو کہتے ہیں "تشاحوا الماء" شح نفس اسی قسم کی ذہنیت کا نام ہے۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے کس طرح ایک لفظ میں اس معاشرے کی پوری کی پوری ذہنیت کا نقشہ کھینچ دیا ہے جس میں ہر فرد اپنے مفاد کو سامنے رکھتا ہے۔ یہ ہے وہ معاشرہ جو بخل (مفاد خویش) کی ذہنیت پر استوار ہوتا ہے۔ اور اس کے برعکس دوسرا معاشرہ وہ ہے جو انفاق (مفاد کل) کے تصور پر قائم ہوتا ہے۔ جس میں ہر پیاسے کی خوشی اس میں ہوتی ہے کہ دوسرا آدمی پہلے پانی پی لے۔ تم نے پروفیسر (HAWTREY) کا یہ قول اوپر دیکھا ہے کہ معاشی نظاموں میں وجہ تفریق صرف یہ ہوتی ہے کہ ان میں لوگوں کے کام کرنے کیلئے جذبۂ محرکہ کیا ہوتا ہے۔ تم غور کرو سلیم! کہ جس معاشرہ میں افراد کی ذہنیت میں اس انداز کی تبدیلی پیدا کر دی جائے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اس کی محکمیت اور افضلیت میں کسے انکار ہو سکتا ہے؟

قرآن اس ذہنیت کو بھی اندھے عقیدہ کی بنا پر نہیں منواتا

قرآن اس ذہنیت کو بھی یونہی اندھے عقیدے کی بنا پر پیدا نہیں کرتا۔ وہ اس کے لئے بھی دلائل پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مختلف افراد معاشرہ میں اکتسابی صلاحیتیں (Earning Capacities) مختلف ہوتی ہیں۔ جس شخص میں اکتسابی استعداد زیادہ ہوتی ہے (اور وہ اس استعداد کو کام میں بھی لاتا ہے) وہ زیادہ کماتا ہے۔ یہ شخص کہتا ہے کہ میں نے جو کچھ کمایا ہے اپنی ہنرمندی سے کمایا ہے۔ اسلئے میں اس کمائی کا مالک ہوں۔ میں اسے کسی دوسرے کو کیوں دیدوں؟۔

مفاد پرستانہ ذہنیت کا نمائندہ "قارون"

قرآن میں قارون کو مفاد پرستانہ ذہنیت کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ سورۂ قصص میں ہے کہ جب اس سے کہا جاتا کہ وہ اپنی اس روش کو

چھوڑ کر جس سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں، وہ روش کیوں نہیں اختیار کرتا جس سے انسانی مساوات کا نظام قائم ہو جائے۔ (ولا تبغ الفساد فی الارض۔ ان اللہ لا یحب المفسدین ۲۸/۷۷) تو وہ اس کے جواب میں کہتا کہ جو کچھ میں نے اپنی ہنرمندی سے کمایا ہے اسے دوسروں کو کیوں دیدوں؟ (قال انما اوتیتہ علیٰ علم عندی) یہ ذہنیت کسی خاص "قارون" کی نہیں۔ ہر دور کا "قارون" (سرمایہ دار) اپنی روش کے جواز میں یہی دلیل پیش کرتا ہے (۲۸/۷۸)۔

تمہاری ہنرمندی میں تمہارا حصہ کتنا ہے؟

قرآن کہتا ہے کہ ذرا سوچو کہ جس چیز کو تم اپنی "ہنرمندی" (علم عندی) قرار دیتے ہو اس میں خود تمہارا حصہ کتنا ہے۔ اور کتنا حصہ تمہیں "مفت" ملا ہے۔ استعداد کا اختلاف پیدائش سے شروع ہو جاتا ہے اس کے بعد اس پر بچے کا ابتدائی ماحول، تربیت اور تعلیم اثر انداز ہوتی ہے۔ پھر مواقع (opportunities) کا سوال سامنے آتا ہے۔ اب سوچو کہ ان تمام مراحل میں خود تمہاری ذاتی "ہنرمندی" کا کسقدر دخل ہوتا ہے اور معاشرے کا کتنا حصہ ہوتا ہے۔ یہ حقیقت بادنیٰ تعمق سامنے آجائے گی کہ تمہاری استعداد و صلاحیت کی بنیادیں ان عوامل (Factors) پر قائم ہوتی ہیں جن میں یا تو تمہارا دخل ہوتا ہی نہیں اور اگر ہوتا ہے تو بہت کم۔

اس کے بعد اُس مرحلے میں آجاؤ جس میں تم اپنی استعداد کو عمل میں لا کر (یعنی محنت کر کے) دولت کماتے ہو۔ اس میں بھی دیکھو کہ تمہاری ہنرمندی کا حصہ کس قدر ہوتا ہے اور کتنا حصہ آفاقی قوتوں (Universal Forces) کا ہوتا ہے۔ قرآن کا انداز یہ ہے سلیم! کہ وہ مجرد حقائق (Abstract Realities) کو محسوس مثالوں (Concrete Examples) کے ذریعے ذہن نشین کراتا ہے۔ چنانچہ وہ اس حقیقت کو اجاگر کرنے کیلئے (جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) کھیتی کی مثال پیش کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ان عوامل و عناصر کو بھی سامنے لاتا ہے جن پر ہماری روزمرہ کی زندگی کا دارومدار ہے۔

کھیتی کی مثال

وہ کہتا ہے کہ غور کرو کہ اس غلّے کی پیدائش میں جسے تم آخر الامر اپنی ملکیت سمجھ کر سمیٹ بیٹھتے ہو، تمہاری "ہنرمندی" کا کتنا حصہ ہے اور کتنا حصہ "ہمارا" ہے۔ وہ کہتا ہے کہ افرءیتم ما تحرثون (۵۶/۶۳) کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ غلہ پیدا کس طرح ہوتا ہے؟ یہ چیز ہر روز تمہارے سامنے آتی ہے؟ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کا تمہیں علم نہ ہو یا جس کا علم حاصل کرنے کیلئے تمہیں کہیں دور دراز جانا پڑے۔ یہ تو تمہارے ہر روز کے مشاہدے کی چیز ہے (افرءیتم؟) دیکھو کہ غلے کی پیداوار میں تمہارا کسقدر حصہ ہوتا ہے؟

زمین کس کی ہے؟

پہلے تو یہ دیکھو کہ خود زمین، جس سے کھیتی اُگتی ہے وہ تمہاری پیدا کردہ نہیں۔ لہٰذا اس کاروبار میں راس المال (Principal investment) بھی تمہارا نہیں۔ اب آگے بڑھو۔ اس زمین میں تم اتنا ہی کرتے ہو کہ ہل جوت کر بیج ڈال دیتے ہو۔ (ما تحرثون) اب سوچو کہ مٹی میں ملے ہوئے بیج سے کونپل کون پیدا کرتا ہے؟ "حرث" کو "زراعت" میں کون تبدیل کرتا ہے؟ کیا یہ کچھ تم کرتے ہو یا خدا کا آفاقی قانون کرتا ہے؟ (ءانتم تزرعونہ ام نحن الزارعون)۔ اگر اس میں ہمارا (یعنی خدا کا قانون) کارفرما نہ ہو تو کھیتی کا اُگنا تو ایک طرف، تمہارے بیج کے دانے بھی مٹی کے ساتھ مٹی ہو جائیں اور اس طرح تمہاری محنت بھی رائیگاں جائے

"حرث" کو "زراعت" میں کون تبدیل کرتا ہے

اور ساتھ مفت کی چٹی بھی پڑ جائے (لونشاء لجعلنہ حطاما فظلتم تفکھون۔ انا لمغرمون۔ بل نحن محرومون) اور تم سر پیٹ کر رہ جاؤ۔

پانی کس نے پیدا کیا ہے؟ اور آگے بڑھو اور سوچو کہ یہ **صاف اور شفاف پانی** جس پر تمام کھیتی کا دارومدار اور خود تمہاری زندگی کا انحصار ہے، تمہاری "ہنرمندی" سے پیدا ہوتا ہے؟ (افرءیتم الماء الذی تشربون) وہ کون ہے جو پانی کو سمندر سے اٹھا کر بادلوں کے مشکیزے میں بھرتا ہے اور اسے تمہاری ضرورتوں کے مطابق جگہ جگہ تقسیم کرتا ہے۔ زائد پانی کو پہاڑوں کی چوٹیوں کے حوضوں (Reservoirs) میں جمع کر دیتا ہے اور اسے آہستہ آہستہ، ندی نالوں میں بہاتا ہوا تمہارے کھیتوں اور مکانوں تک لے آتا ہے۔ (ءانتم انزلتموہ من المزن ام نحن المنزلون)۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچو کہ یہ کس کا انتظام ہے کہ سمندر کے پانی کے تمام نمک (جس سے وہ پانی نہ پینے کے قابل رہتا ہے نہ زراعت کے کام آسکتا ہے) وہیں رہ جاتے ہیں اور کشید کردہ مقطر پانی، تمہاری صراحیوں اور کھیتوں میں پہنچ جاتا ہے۔ (لونشاء جعلنہ اجاجا فلولا تشکرون)۔

تمازت و حرارت کس کی پیدا کردہ ہے؟ اور آگے بڑھو اور سوچو کہ **تمازت اور حرارت** جس پر نشوونما اور ہست و بود کا انحصار ہے کس کے قانون سے تپش آبادہ رہتی ہے؟ کیا اس کی حرارت تمہاری پیدا کردہ ہے؟ (افرءیتم النار التی تورون۔ ءانتم انشاتم شجرتھا ام نحن المنشئون)۔ غور کرو اور بتاؤ کہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون — کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار — خاک یہ کس کی ہے۔ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب — موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

اب سوچو کہ تمہارا اور ہمارا یہ مشترکہ کاروبار تھا۔ اس میں دیکھو کہ تمہارا حصہ کس قدر ہے اور ہمارا حصہ کسقدر؟ جس نسبت سے تمہارا اور ہمارا حصہ ہے اسی نسبت سے **اس کاروبار کا منافعہ** (یعنی پیداوار) **تقسیم کر لو۔ تم اپنا حصہ آپ لیلو اور ہمارا حصہ وہاں پہنچا دو جہاں ہم کہتے ہیں**۔ یہ حصہ ان ضرورت مندوں کا ہے جن میں اکتسابی استعداد کم ہے یعنی وہ معاشرہ کے دوسرے کاموں میں لگے ہوئے ہیں یا جن کی استعداد کسی وجہ سے سلب ہو چکی ہے۔ ہم نے اس حصہ کو انہی کے لئے مختص کر رکھا ہے۔ (نحن جعلنٰھا تذکرۃ ومتاعا للمقوین) مقوین کے معنی ہیں بھوکے۔ یہ ہے وہ طریقہ جس سے ربوبیت اعلیٰ کا انتظام ہو سکے گا۔ پس تمہیں چاہئے کہ اس نظام ربوبیت کے قیام کے لئے کوشاں رہو (فسبح بحمد ربک العظیم۔ ۵۶/۷۴-۶۳)

سلیم! تم نے دیکھا کہ قرآن کس بلیغ انداز سے اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ جس ماحصل کو انسان اپنی ہنرمندی اور کاری گری کا نتیجہ قرار دیتا ہے اس میں خود انسان کا کتنا حصہ ہوتا ہے اور کس قدر حصہ ان عناصر و عوامل کا ہوتا ہے جن کے پیدا کرنے یا بروئے کار لانے میں اسے کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ عناصر یا تو اس معاشرہ کے پیدا کردہ ہوتے ہیں جس میں وہ فرد پرورش پاتا ہے (مثلاً صحت اور غذا

استعداد اور صلاحیت کی زیادتی کا نتیجہ تمہاری ملکیت نہیں کا انتظام، تعلیم و تربیت کے ادارے۔ سازگار ماحول اور مساعد فضا وغیرہ وغیرہ) - یا کائنات میں بکھری ہوئی نعمتیں جو بلا محنت و مشقت

حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً زمین، پانی، ہوا، روشنی، گرمی وغیرہ۔ اسی لئے قرآن دوسری جگہ کہتا ہے کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ جو چیز تمہاری استعداد اور صلاحیت کی زیادتی کا نتیجہ ہے اس پر تمہیں حق ملکیت حاصل ہے۔ سورۂ نحل میں ہے کہ یہ حقیقت ہے کہ تم میں سے بعض افراد کو دوسرے افراد کے مقابلہ میں زیادہ اکتسابی قوتیں حاصل ہیں، لیکن یہ استعداد تمہاری اپنی پیدا کردہ نہیں۔ قانون خداوندی کی عطا فرمودہ ہے۔ (واللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق (۱۶/۷۱)) لہٰذا جب حقیقت یہ ہے تو پھر اس استعداد کا ماحصل تمہاری ذاتی ملکیت کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس ماحصل کی تقسیم اس طرح ہونی چاہئے کہ کم استعداد کے لوگ جو چھوٹے چھوٹے کاموں پر مامور ہیں اس سے ان کی ضروریات زندگی کا سامان مہیا کیا جائے۔ (فما الذین فضلوا برادی رزقھم علی ما ملکت ایمانھم) قرآن کہتا ہے کہ تم اس تقسیم کو اس لئے اختیار نہیں کرنا چاہتے کہ تم سمجھتے ہو کہ اس سے زیادہ اور کم استعداد والے لوگ سب برابر ہو جائیں گے۔ (فھم فیہ سواء)

قوت و استعداد خدا کا عطیہ ہے جو تمہاری ملکیت نہیں

وہ کہتا ہے کہ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ تمہیں جو قوت اور استعداد خدا کی طرف سے بطور بخشائش ملی ہے تم اسے اپنی ملکیت تصور کرتے ہو اور اس کے عطیۂ خداوندی ہونے سے انکار کرتے ہو (افبنعمۃ اللہ یجحدون) وہ کہتا ہے کہ یہ انداز نگاہ بالکل غلط ہے کہ تم عطایائے خداوندی کو سمیٹ کر اپنی ہی ذات کے لئے مختص کر لو۔ جب ہم نے اپنے عطیات (سامانِ پرورش) میں حد بندیاں نہیں کیں تو کسی انسان کو کیا حق حاصل ہے کہ انھیں محدود اور مقید کر کے رکھ لے۔ (وما کان عطاء ربک محظورا (۱۷/۲۰))۔

تم نے دیکھا سلیم! قرآن کریم کس طرح اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ مفاد پرستانہ گروہ (یعنی سرمایہ دارانہ ذہنیت) کی یہ دلیل کہ جس دولت کو ہم اپنی ہنرمندیوں سے پیدا کرتے ہیں اسے دوسروں کو کیوں دیدیا جائے، کس قدر نگاہ کا فریب اور حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان جس چیز کو اپنی ہنرمندی قرار دیتا ہے اس میں اسکا اپنا حصہ بہت تھوڑا ہوتا ہے باقی سب کچھ فطرت کے عطایا ہوتے ہیں۔ اور فطرت نے ان قوتوں اور نعمتوں کو عطا اس لئے کیا ہے کہ اس طریق سے نوع انسانی کی ربوبیت کا سامان بہم پہنچ سکے۔ قرآن اس حقیقت کو ایمان کی

دونوں راہوں میں علم و بصیرت کی راہ کونسی ہے؟

حیثیت سے تسلیم کرانا چاہتا ہے یعنی وہ کہتا ہے کہ یہ دونوں راستے تمہارے سامنے کھلے ہیں۔ تم سوچو کہ ان میں سے کون سی راہ علم و بصیرت اور دلیل و برہان کی راہ ہے۔ اگر تم اس دعوے سے متفق ہو جاؤ کہ صحیح علم و بصیرت کی راہ وہی ہے جس کا نتیجہ نوعِ انسانی کی منفعت ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تم نے اس راستہ کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا۔ اب سوچو کہ جو قوم اس حقیقت کو اپنی زندگی کا نصب العین اور اپنے سفر حیات کی منزلِ مقصود قرار دے لے۔ کیا ان کے دل میں کبھی یہ خیال تک بھی آئیگا کہ ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہم دن رات محنت کرتے رہیں اور اس محنت کا ماحصل دوسروں کی

پرورش اور تربیت کے لئے صرف کر دیا جائے؟ ان کا تو دعویٰ یہ ہوگا کہ ہمارا نصب العین زندگی یہ ہے کہ ہم خدا کی صفت رب العلمینی کا مظہر بنیں اس لئے ہماری ہر حرکت اسی محور کے گرد گردش کرے گی (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔ قرآن نے اس جماعت کا نام ربانیون کی جماعت رکھا ہے۔ اس کی تعلیم کا مقصد ہی اس قسم کی جماعت پیدا کرنا تھا۔

ذاتی ملکیت کا سوال ہی نہیں!

اب تم خود سوچو سلیم! کہ قرآن کی تعلیم کا ماحصل کیا ہے۔ اس تعلیم کی رو سے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ زرِ فاضلہ کس کے پاس رہے اور ذرائع پیداوار کس کی ملکیت میں۔ اسکی تعلیم کا ماحصل یہ ہے کہ قدرتی پیداوار اور انسانوں کی محنت کا ماحصل سب کے سب نوعِ انسانی کی پرورش (ربوبیت) کیلئے صرف ہوں۔ اور ہر فرد اپنی زندگی کا یہی نصب العین قرار دے۔ لہٰذا جب منتہائے نگاہ پوری انسانیت کی پرورش و تربیت ٹھہرے تو اس ذاتی ملکیت کا سوال ہی کیسے پیدا ہو سکتا ہے جس میں ماحصلِ پیدائش و محنت، کسی ایک فرد یا چند افراد کی ذات کیلئے محدود و مختص ہو کر رہ جائیں۔

میرے فہم قرآن کی رو سے سلیم! قرآن کی غائت اس قسم کا نظام قائم کرنا ہے جس میں پوری کی پوری انسانیت کی پرورش (ربوبیت) ہو سکے اور تمام افرادِ انسانیہ خدا کی معاشی سہولتوں سے یکساں طور پر متمتع ہو سکیں۔ یہی اسلام کا منتہیٰ ہے۔

اگر بایں نرسیدی تمام بولہبی است

مجھے تمہاری تجویز سے پورا اتفاق ہے سلیم! کہ قرآنی نظامِ ربوبیت (Quranic Socialism) کے متعلق اس طرح منتشر طور پر، متفرق مضامین اور خطوط میں لکھنے کی بجائے، ایک مختصر سی کتاب میں، جامع طور پر، سب کچھ ایک جگہ لکھ دیا جائے تاکہ اس کے سمجھنے میں آسانی رہے۔ تمہارے خط ملنے پر میں نے اسے کتابی شکل میں ترتیب دینا شروع کر دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب جلدی تم تک پہنچ جائیگی۔ تمہارا تقاضا ٹالا نہیں جا سکتا۔

میں نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ میں نے تمہیں آجتک جتنے خطوط لکھے ہیں انھیں یکجا شائع کر دیا جائے۔ کیوں؟ تمہیں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں؟

اچھا۔ خدا حافظ

پرویز

ایجنٹ صاحبان متوجہ ہوں

"نظام اسلام" "قرآنی دستور پاکستان" اور "اسباب زوال امت" کی کسقدر کاپیاں آپ کو مطلوب ہیں جلد مطلع فرمائیے

(اشتہار صـ۱۲ اور صـ۱۳ پر ملاحظہ فرمائیے)

مقامِ حدیث

امام اعظم ابوحنیفہؒ کی نظر میں

اگر آپ کو مذہب اور مذہبیات سے کچھ دلچسپی ہے تو آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ آجکل فضا میں ایک خاص آواز گونج رہی ہے اور وہ ہے طلوع اسلام کی مخالفت۔ شاید ہی کوئی محراب و منبر ایسا ہو جہاں سے یہ آواز نہ بلند ہوتی ہو کہ طلوع اسلام دورِ حاضر کا سب سے بڑا فتنہ ہے، اس نے ایک نیا اسلام وضع کر رکھا ہے، یہ مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتا ہے، جو کچھ یہ کہتا ہے تیرہ سو سال میں کبھی سننے میں نہیں آیا۔ اس سے اسلام کا طلوع نہیں بلکہ غروب مقصود ہے۔ کہیں ان "متشابہات" ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے اور کہیں اس سے آگے بڑھ کر "محکمات" تک اترا جاتا ہے۔ اسے کھلے بندوں گالیاں دی جاتی ہیں۔ گردن زدنی اور کشتنی قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے خلاف کفر کے فتوے صادر کئے جاتے ہیں۔ اور اس روزِ سعید کا انتظار کیا جا رہا ہے جب پاکستان میں شریعتِ اسلامی کا راج ہوگا اور اس قسم کے مرتدین کو حوالۂ دار و رسن کیا جائے گا۔ گوئرنگ نے کہا تھا کہ کسی جھوٹی بات کو سو مرتبہ دہرائیے وہ سچ بن کر دکھائی دینے لگے گی۔ طلوع اسلام کے خلاف اس پروپیگنڈے کو بھی گوئرنگ کے اصول کے ماتحت عمل میں لایا جا رہا ہے۔ اس لئے اس سے ان لوگوں کا متاثر ہو جانا کچھ بعید نہیں جو طلوع اسلام کا مسلسل مطالعہ نہیں کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ

طلوعِ اسلام کا مسلک

(۱) طلوع اسلام کیا کہتا ہے؟

(۲) یہ جو کچھ کہتا ہے کیا وہ کوئی نئی بات ہے؟

یا

ہمارے بزرگوں میں سے بھی کسی نے وہی کچھ کہا ہے؟

(۳) ایسا کہنے والوں کی مخالفت بھی کوئی نئی چیز ہے یا ان بزرگوں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا رہا ہے؟

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ طلوع اسلام کا جرم کیا ہے؟ طلوع اسلام کی دعوت یہ ہے کہ قرآن کریم وہ ضابطۂ زندگی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے دین کی تکمیل کر دی ہے۔ اس میں نہ کسی قسم کا ردوبدل ہو سکتا ہے نہ نسخ و اضافہ۔ انسانی زندگی کے لئے جس قدر رہنمائی کی ضرورت تھی اسے اصولی طور پر قرآن میں دیدیا گیا ہے اور اس کے بعد قرآن پر ایمان رکھنے والوں سے کہدیا گیا ہے کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانہ کے تقاضہ کے مطابق اجتہادی طور پر جزئی قوانین مرتب کر لیں۔ یہی کچھ رسول اللہؐ نے کیا تھا، یہی خلفائے راشدینؓ نے کیا اور ان کے بعد ایسا ہی ہر دور کے مسلمانوں کو کرنا چاہئے تھا۔ ہمیں بھی آج ایسا ہی کرنا چاہئے۔

بس یہ ہے "ہمارا جرم" اب یہ دیکھئے کہ کیا یہ جرم ہمارا ہی ہے یا اس جرم میں ہمارے ساتھ اور لوگ بھی شریک ہیں۔ اور اگر شریک ہیں تو وہ کون ہیں؟

رسول اللہ صلعم نے قرآن کے سوا کچھ نہیں چھوڑا

عبدالعزیز بن رفیع کہتے ہیں کہ میں اور شداد بن معقل حضرت ابن عباسؓ کے پاس گئے تو شداد نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ صلعم نے اپنے بعد کچھ چھوڑا تھا۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ بجز اس قرآن کے جو دفتین میں محفوظ ہے آپ نے اور کچھ نہیں چھوڑا۔ اسی طرح ہم دونوں محمد بن الحنفیہ کے پاس گئے اور ان سے بھی ہم نے یہی سوال کیا تو انہوں نے بھی یہی جواب دیا کہ آپ نے اس قرآن کے سوا جو دفتین میں محفوظ ہے اور کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۵۱)

میں صرف اس چیز کو حرام کرتا ہوں جسکو قرآن نے حرام کیا ہے

امام ابو یوسفؒ اپنی کتاب تنقید سیر الاوزاعی میں تحریر فرماتے ہیں:-

> جو چیز قرآن کے مخالف ہو گو اس کی روایت کی جائے لیکن وہ رسول اللہ صلعم کی حدیث نہیں ہے۔ ہم سے معتبر لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے اپنے مرض الموت میں فرمایا کہ میں صرف اس چیز کو حرام کرتا ہوں جس کو قرآن نے حرام کیا ہے، خدا کی قسم وہ لوگ کسی چیز سے مجھ پر تمسک نہ پکڑیں الخ (تاریخ فقہ اسلامی ص ۲۶۷)

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے صحابہؓ کو روایت حدیث سے منع کیا

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں مراسیل ابن ابی ملیکہ سے یہ روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم لوگ رسول اللہ صلعم سے ایسی حدیثیں روایت کرتے ہو جن میں تم لوگوں میں اختلاف ہوتا ہے اور تمہارے بعد جو لوگ ہوں گے ان میں اس سے بھی زیادہ اختلاف ہوگا۔ تو رسول اللہ صلعم سے کوئی حدیث روایت نہ کرو۔ جو شخص تم سے سوال کرے اس سے کہو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان خدا کی کتاب ہے۔ اس کے حلال کئے ہوئے کو حلال اور اس کے حرام کئے ہوئے کو حرام سمجھو۔ (تاریخ فقہ اسلامی ص ۱۶۱)

حضرت عمر فاروقؓ نے صحابہؓ کو روایت حدیث سے منع فرمایا

حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ شعبہ وغیرہ نے بیان سے اور بیان نے شعبی سے اور شعبی نے قرظہ بن کعبؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب ہم کو عراق کی طرف روانہ فرمایا تو ہمارے ساتھ خود بھی چلے اور فرمایا تم کو معلوم ہے کہ میں کیوں تمہاری مشایعت کر رہا ہوں؟ لوگوں نے کہا ہاں ہماری عزت افزائی کیلئے۔ بولے اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ تم ایسی آبادی کے لوگوں کے پاس جاتے ہو جو شہد کی مکھیوں کی طرح گنگنا گنگنا کر قرآن مجید پڑھتے ہیں۔ تم احادیث کی روایت کرکے ان کی تلاوت قرآن میں رکاوٹ نہ پیدا کرنا صرف قرآن مجید پر بس کرو۔ اور رسول اللہ صلعم سے روایت کم کرو، اور اس میں میں بھی تمہارا شریک ہوں۔ چنانچہ جب قرظہؓ آئے تو لوگوں نے روایت حدیث کی خواہش کی انھوں نے جواب دیا کہ ہم کو حضرت عمرؓ نے اس کی ممانعت کی ہے۔ (ایضاً ص ۱۶۳)

حضرت علیؓ رسول اللہ صلعم کی حدیث قبول نہیں کرتے تھے

امام ابویوسفؒ نے سیر الاوزاعی کی تنقید میں جو کتاب لکھی ہے جسے امام شافعیؒ نے کتاب الام میں روایت کیا ہے۔ اس میں امام ابویوسفؒ تحریر فرماتے ہیں:-

اور اگر کتاب طویل نہ ہو جاتی تو میں تمہارے لئے بسند حدیث بیان کرتا کہ حضرت علیؓ ابن ابی طالب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہی کو قبول نہیں کرتے تھے۔ (تاریخ فقہ اسلامی ص ۳۶۷)

حضرت امیر معاویہؓ بھی حضرت عمرؓ کے مسلک کے متبع تھے

ابن علیہ نے رجاء بن ابی سلمہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا کہ ہم کو یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ یہ کہا کرتے تھے کہ تم لوگ بھی حدیث کے ساتھ وہی طرزِ عمل اختیار کرو جو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جاری تھا کیونکہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایتِ حدیث کرنے کے متعلق لوگوں کو دھمکیاں دی تھیں۔ (ایضاً ص ۱۶۲-۱۶۳)

ان حضرات کا احادیث کو رد کرنا حدیث کی دینی حیثیت نہ رکھنے کی دلیل ہے

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت فاروق اعظمؓ، حضرت علی مرتضیٰؓ، اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا فیصلہ احادیث کے متعلق کیا ہے۔ اس کے ساتھ ذرا اس نکتہ پر بھی غور فرمایئے کہ احادیث رسولؐ کے متعلق ان حضرات کا یہ فیصلہ کیوں ہے؟

ظاہر ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ اور علی مرتضیٰؓ اور امیر معاویہؓ کے عہد سعادت بعد میں ہیں اور آپ امام بخاریؒ اور امام مسلم حدیثیں بیان کرنے کیلئے نہیں ہوتے تھے بلکہ حضرات صحابہؓ ہی حدیثیں بیان کرنے والے ہو سکتے تھے جن کے درمیان اور رسول اللہ صلعم کے درمیان کوئی دوسرا واسطہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس سند کے متعلق صحیح اور ضعیف ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ روایتیں بیان کرنے والے وہ اصحاب رسول اللہ صلعم ہی تو ہیں جن کے متعلق خود ائمۂ حدیث کا یہ مسلّمہ اصول ہے کہ "اصحابی کلھم عدول بأیھم اقتدیتم اهتدیتم" (میرے سارے اصحاب ثقہ اور عادل ہیں۔ ان میں سے تم جس کی بھی پیروی کرلوگے ہدایت پالوگے) مگر اس کے باوجود بھی یہ حضرات وہ کچھ فرما رہے ہیں جو آپ ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کی صرف ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ ان حضرات کے نزدیک حدیث کی وہ حیثیت ہی نہیں ہوتی تھی جو آج اس کو حیثیت دی گئی ہے وہ حضرات جانتے تھے کہ خود رسول اللہ صلعم کا منشا بھی یہ نہیں تھا کہ آپ کے یہ ارشادات ہمیشہ ہمیشہ کیلئے امت کا دستور العمل بنا دیئے جائیں۔ وہ بقول حضرت صدیق اکبرؓ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ "جو شخص تم سے سوال کرے اس سے کہو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان صرف خدا کی کتاب ہے، اسی کے حلال کئے ہوئے حلال اور اسی کے حرام کئے ہوئے کو حرام سمجھو"۔ (حضرت صدیق اکبرؓ) وہ اس حقیقت کو بھولے نہیں تھے کہ جن امور کی تفصیل قرآن میں نہیں ہوتی تھی ان کے متعلق رسول اللہؐ اپنے صحابہؓ سے مشورہ کیا کرتے تھے اور جو رائے بہتر نظر آتی اسے اختیار کر لیا جاتا اور وہی شریعت کا حکم قرار پا جاتی تھی۔ لہٰذا وہ جانتے تھے کہ دین میں غیر متبدل چیز صرف قرآن ہے باقی احکام عند الضرورت بدلے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود رسول اللہ کے صادر کئے ہوئے

فیصلوں میں بھی ردّ و بدل کیا۔ اس دور میں یہی مسلک رائج رہا اور کبھی یہ سوال پیدا نہ ہوا کہ احادیث رسول اللہؐ کو بھی قرآن کی طرح ضبط تحریر میں لا کر محفوظ کر لیا جائے۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جس میں یہ کام سب سے زیادہ آسان تھا۔ یہی نہیں کہ انھیں اس کی طرف خیال نہیں آیا۔ ان کے سامنے یہ سوال آیا اور وہ غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کی ضرورت نہیں چنانچہ سیوطیؒ نے

صحابہؓ نے حدیث کے متعلق غور و فکر کے بعد یہ رائے قائم کی تھی۔

تنویر الحوالک شرح موطا امام مالک میں ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے احادیث کو لکھوانے کا خیال کیا اور اس کی بابت صحابہؓ سے مشورہ کیا تو عام صحابہؓ نے بھی ان کے خیال کی تائید کی لیکن اس کے بعد حضرت عمرؓ اس معاملہ میں مزید غور و فکر کرتے رہے اور قریب ایک مہینہ کے بعد انھوں نے یقینی رائے قائم کر لی اور فرمایا کہ جیسا کہ تم لوگوں کو معلوم ہے میں نے تم سے تحریر حدیث کا ذکر کیا تھا۔ پھر میں نے اس میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ ہم سے پہلے اہل کتاب میں سے بہت لوگوں نے کتاب اللہ کے ساتھ اور کتابیں لکھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انہی کتابوں میں مشغول ہو گئے اور کتاب اللہ کو چھوڑ دیا۔ اس بنا پر خدا کی قسم میں کتاب اللہ کو کسی اور چیز کے ساتھ مخلوط نہ کروں گا۔ اس لئے انھوں نے تحریر احادیث کا ارادہ ترک کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں ہمیں نہ کہیں حدیث کی کوئی کتاب نظر آتی ہے نہ اہل حدیث کا کوئی فرقہ۔

امام اعظمؒ نے تدوین فقہ میں حدیثوں سے بہت کم مدد لی

قرآن کریم کے اصولوں کی روشنی میں جزئیات مرتب کرنے کو فقہ کہتے ہیں۔ دورِ صحابہ میں فقہ کے کوئی خاص اصول مدوّن نہیں ہوئے تھے۔ اس باب میں سب سے پہلی اور نہایت کامیاب کوشش امام ابو حنیفہؒ کی ہے جو امت میں امام اعظمؒ کے لقب سے متعارف ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ان کا صحیح مقام بھی یہی تھا۔ وہ فن فقہ کے امام تھے اور بہت بڑے امام۔ ان کی فقہ پر آج تک عمل ہوتا چلا آ رہا ہے اور اس وقت بھی دنیا کے مسلمانوں کی اکثریت اسی فقہ کی تقلید کرتی ہے۔ اس حقیقت سے ہر صاحب علم واقف ہے کہ امام اعظمؒ کی فقہ کا مدار قیاس پر ہے۔ قیاس کے معنی یہ ہیں کہ ہم قرآن کریم کے اصولوں کی روشنی میں اپنے اجتہاد سے جزئیات مرتب کریں۔ اہل علم حضرات سے یہ حقیقت بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ امام اعظمؒ نے اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے بہت کم مدد لی ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ انھیں حدیثیں مل نہیں سکتی تھیں وہ ایک قول کے مطابق ۶۱ھ میں اور دوسرے قول کے مطابق ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ تک زندہ رہے اس دور میں حدیثوں کا جمع کرنا اس زمانہ سے زیادہ آسان تھا جس میں "امام بخاری" (متوفی ۲۵۶ھ) نے یہ کام کیا۔ جہاں تک احادیث کی پہچان کا تعلق ہے محمد بن سماعہ کہتے ہیں کہ میں نے امام ابو یوسفؒ کو کہتے ہوئے سنا کہ میں اکثر احادیث کی طرف مائل ہو گیا ہوں مگر یہ واقعہ ہے کہ ابو حنیفہ کو صحیح حدیث کی پہچان مجھ سے کہیں زیادہ تھی۔ (تاریخ خطیب بغدادی صفحہ ۳۴۰/۱۳)

اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نہ تو حدیث کو وحی الٰہی کی طرح غیر متبدل سمجھتے تھے اور نہ ہی شک و شبہ سے بالا۔ وہ دین کی بنیاد سرتاپا یقینیات پر قائم سمجھتے تھے اور یقینی دین صرف کتاب اللہ کے اندر محصور تھا۔ چنانچہ علی ابن المدینیؒ عبدالرزاق سے نقل کرتے ہیں کہ میں معمر کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ عبداللہ ابن المبارک آ گئے تو ہم نے معمر کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں ایسے شخص سے واقف نہیں ہوں

جو ابو حنیفہؒ سے زیادہ بہتر طور پر فقہ میں کلام کر سکے اور عقل و قیاس سے کام لے سکے اور مخلوق کے لئے فقہ میں نجات کی راہ کو کھول کر بیان کر سکے اور خدا کے دین میں شک و شبہ کی کوئی بات داخل کرنے سے ابو حنیفہ سے زیادہ ڈرنے والا ہو۔ (خطیب ص۳۳۹ ج۱۳) وہ کتاب اللہ کی روشنی میں اپنے اجتہاد اور اہل الرائے کے مشورہ سے فقہ کی تدوین کرتے۔ اس کے بعد اگر کوئی یہ کہتا کہ آپ کا یہ فیصلہ رسول اللہؐ کی حدیث کے خلاف ہے تو وہ اس کے جواب میں یہی کہتے جو حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ رسول اللہؐ کا وہ فیصلہ اس زمانہ کیلئے تھا اب حالات بدل چکے ہیں اسلئے اس فیصلہ میں بھی تبدیلی ہونی ضروری ہے۔ یا وہ حضرت عائشہ رضؓ اور دیگر صحابہؓ کے اتباع میں یہ کہتے کہ کیا معلوم رسول اللہؐ نے کیا فرمایا تھا اور سننے والے نے اسے کیا سمجھا۔ ہم کتاب اللہ کی موجودگی میں اس قسم کی غیر یقینی چیزوں کو دین کا حصہ نہیں قرار دے سکتے۔ چونکہ وہ اس حقیقت کو واضح طور پر نمایاں کر دینا چاہتے تھے کہ احادیث رسول اللہؐ نہ تو یقینی ہیں اور نہ غیر متبدل اسلئے وہ بعض اوقات حدیث کے رد میں شدت تک بھی اختیار کر لیتے تھے۔

امام ابو حنیفہؒ احادیث کو ناقابل تبدیل نہیں سمجھتے تھے اور ضرورت پڑنے پر سختی کے ساتھ رد کر دیا کرتے تھے

امام سفیان بن عیینہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابو حنیفہؒ سے زیادہ کسی کو اللہ پر جرأت کرنے والا نہیں دیکھا۔ وہ رسول اللہ صلعم کی احادیث کے لئے مثالیں گھڑتے اور ان کو رد کر دیا کرتے تھے۔ امام ابو حنیفہؒ کو معلوم ہوا کہ میں یہ حدیث نقل کرتا ہوں "ان البیعان بالخیار مالم یتفرقا" (بائع اور مشتری جبتک علیحدہ نہ ہو جائیں انھیں معاملہ کو فسخ کر دینے کا اختیار رہتا ہے) ابو حنیفہؒ کہنے لگے "ذرا بتاؤ تو سہی اگر دونوں کسی ایک کشتی میں سفر کر رہے ہوں، اگر دونوں قید خانہ میں ایک ساتھ ہی قید ہوں، اگر دونوں ایک ساتھ ہی کسی سفر میں ہوں تو کس طرح جدا ہوں گے، (اور کیونکر ان کا معاملہ تکمیل پذیر ہوگا) مفضل بن موسیٰ سینانی کہتے ہیں کہ میں نے خود ابو حنیفہؒ کو کہتے سنا ہے کہ میرے اصحاب میں ایسے لوگ موجود ہیں جو دو قلے پیشاب کر دیتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ نے نبی صلعم کی اس حدیث کو کہ "پانی اگر دو قلے ہو تو وہ نجس نہیں ہوتا" رد کرتے ہوئے ایسا فرمایا تھا (خطیب ج۱۳ ص۳۸۹)

امام اعظمؒ نے چار سو سے زیادہ احادیث رد کر دیا

ابو صالح فراء کہتے ہیں کہ میں نے یوسف بن اسباط کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ "امام ابو حنیفہؒ نے رسول اللہ صلعم پر چار سو بلکہ چار سو سے بھی زیادہ حدیثوں کو رد کر دیا ہے"۔ میں نے یوسف سے پوچھا۔ اے ابو محمد! آپ کو وہ حدیثیں معلوم ہیں کہنے لگے ہاں معلوم ہیں۔ میں نے کہا تو مجھے کچھ حدیثیں بتائیے۔ یوسف بن اسباط نے کہا کہ رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے کہ "مال غنیمت میں گھوڑے کے دو حصے اور پیادہ آدمی کا ایک حصہ ہے"۔ مگر ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ میں ایک جانور کا حصہ ایک مومن کے حصہ سے زیادہ نہیں کر سکتا"۔ حضور اکرم صلعم اور آپ کے اصحاب نے برابر قربانی کے جانوروں پر نیزہ مار کر نشان لگایا ہے مگر ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ "ایسا کرنا ایک جاندار کی صورت کو بگاڑنا ہے"۔ رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے کہ "جبتک فروخت کرنے والا اور خریدار جدا نہ ہوں ان کو بیع فسخ کر دینے کا اختیار رہتا ہے مگر ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ جب معاملہ ہو چکا تو پھر کوئی اختیار نہیں رہتا"۔ رسول اللہ صلعم کہیں

سفر میں تشریف لیجاتے تو ہمراہ لیجانے کیلئے ازواج مطہرات کے درمیان قرعہ اندازی فرمایا کرتے تھے۔ آپ کے اصحابؓ کا بھی اسی پر عمل رہا مگر ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ قرعہ اندازی خالص قمار اور جُوا ہے۔

ابو سائب کہتے ہیں کہ میں نے (حدیث کے مشہور امام) وکیع کو کہتے ہوئے سنا کہ ہم نے ابوحنیفہؒ کو دو سو حدیثوں کی مخالفت کرتے ہوئے پایا ہے"۔ عبدالاعلیٰ بن حمادؒ اپنے والد حماد بن سلمہ سے نقل کرتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کے سامنے رسول اللہؐ کی حدیثیں آتی تھیں مگر وہ اپنی رائے سے ان کو رد کر دیا کرتے تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے بھی مؤمل کے واسطہ سے حماد بن سلمہ کا یہی قول نقل کیا ہے۔ (خطیب ج ۱۳ ص ۳۹۰-۹۱)

انکارِ حدیث میں امام ابوحنیفہؒ کا تشدد

ابو اسحٰق فزاری کہتے ہیں کہ میں ابوحنیفہ کے پاس جاکر مسائل جہاد کے متعلق سوالات کیا کرتا تھا ایک دن میں نے ایک مسئلہ پوچھا۔ ابوحنیفہؒ نے اس کا جواب دیا۔ اس پر میں نے کہا کہ اس بارہ رسول اللہ صلعم کا ارشاد تو اس طرح ہے۔ ابوحنیفہؒ نے کہا "ہمیں اس سے معاف رکھو"۔ ایسے ہی ایک اور دن میں نے ان سے ایک مسئلہ پوچھا جس کا انھوں نے جواب دیا میں نے پھر کہا کہ اس بارہ میں رسول اللہ صلعم سے تو ایسا ایسا منقول ہے۔ تو ابوحنیفہؒ نے کہا "اسے لیجا کر خنزیر[1] کی دم سر رگڑ دو"۔ ابو اسحٰق فزاری کہتے ہیں کہ میں نے بادشاہِ وقت کے خلاف خروج (بغاوت) کے ناجائز ہونے پر ابوحنیفہؒ کے سامنے ایک حدیث بیان کی تو ابوحنیفہؒ کہنے لگے کہ یہ حدیث، خرافات میں سے ہے۔ علی ابن عاصم کہتے ہیں کہ ہم نے ابوحنیفہؒ کو رسول اللہ صلعم کی حدیث سنائی تو ابوحنیفہ نے کہا کہ میں اسے قبول (تسلیم) نہیں کرتا۔ میں نے کہا کہ یہ رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے، ابوحنیفہؒ نے پھر کہا۔ ہاں ہاں میں اس کو قبول نہیں کرتا۔ (خطیب ج ۱۳ ص ۳۸۷)۔

بشر بن المفضل کہتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہؒ سے بیان کیا کہ نافعؒ ابن عمرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی صلعم نے ارشاد فرمایا۔ بائع اور مشتری (فروخت کنندہ اور خریدار) جب تک جدا نہ ہو جائیں انھیں فسخ بیع کا اختیار رہتا ہے۔ ابوحنیفہؒ نے کہا یہ تو محض ایک رجز (جنگی گیت) ہے۔ میں نے کہا کہ قتادہؒ حضرت انسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک یہودی نے ایک مسلمان لڑکی کا سر دو پتھروں کے درمیان کچل دیا تھا تو رسول اللہ صلعم نے بھی اس یہودی کا سر دو پتھروں کے درمیان کچل دیا۔ ابوحنیفہؒ نے کہا کہ یہ محض بکواس (ہذیان) ہے۔ عبدالصمد اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کے سامنے رسول اللہ صلعم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا (افطر الحاجم والمحجوم) سینگی لگوانے والے اور لگانے والے، دونوں کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ابوحنیفہؒ نے کہا یہ محض قافیہ بندی ہے۔ ایسے ہی ان کے سامنے ولاء کے بارہ میں حضرت عمرؓ کا ایک فیصلہ نقل کیا گیا تو ابوحنیفہؒ نے کہا یہ کسی شیطان کا قول ہے۔ عبدالوارث نے بھی ایسا ہی نقل کیا ہے۔ یحییٰ ابن آدم کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کے سامنے یہ حدیث نقل کی گئی کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے "وضوء آدھا ایمان ہے"۔ ابوحنیفہؒ کہنے لگے پھر تو دو مرتبہ وضو کر ڈالو تاکہ تمہارا ایمان مکمل ہو جائے۔ اسی طرح ابوحنیفہؒ کے سامنے یہ ارشاد نقل کیا گیا کہ "لا ادری" (میں نہیں جانتا) کہدینا بھی آدھا علم ہے"۔ ابوحنیفہؒ کہنے لگے کہ "بس پھر تو دو مرتبہ لا ادری کہدینا چاہیئے تاکہ علم مکمل ہو جائے۔

---

[1] امام اعظمؒ کے اصل عربی الفاظ یہ ہیں فقال حك هذا بذنب خنزير (خطیب ص ۳۸۷ ج ۱۳ سطر ۱۲)

یہ احکام گذر چکے اور ختم ہو چکے

بشر ابن السری کہتے ہیں کہ میں ابو عوانہ کے پاس گیا اور میں نے ان سے کہا کہ میں نے سُنا ہے کہ آپ کے پاس ابو حنیفہؒ کی کوئی کتاب ہے۔ ذرا اسے نکال دیجئے (میں اس کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں) ابو عوانہ کہنے لگے بیٹا! تم نے خوب یاد دلایا۔ چنانچہ وہ ایک صندوق کی طرف اٹھکر گئے اور ایک کتاب نکالی اور ریزہ ریزہ کر کے اسے پھینکدی۔ میں نے عرض کیا کہ آپ نے یہ کیا غضب کیا۔ کہنے لگے "میں ایک روز ابو حنیفہؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایلچی آیا۔ اس نے کہا امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا چھتہ چرا لیا ہے۔ اس کے بارہ میں کیا حکم ہے؟ ابو حنیفہؒ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ ایلچی چلا گیا تو میں نے ابو حنیفہؒ سے کہا "تم خدا سے نہیں ڈرتے؟ مجھ سے یحییٰ بن سعید (قطان) نے بیان کیا ہے، انھوں نے محمد بن جبان سے، انھوں نے رافع بن خدیج سے کہ رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا ہے کہ پھل پھلواری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ فوراً اس آدمی کی مدد کو پہنچئے ورنہ امیر کے ہاں اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ ابو حنیفہؒ نے پھر بلا کسی ہچکچاہٹ کے کہا: "یہ حکم گذر چکا اور ختم ہو چکا" چنانچہ اس چور کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ ایسے آدمی کی کوئی کتاب میرے پاس نہیں رہنی چاہئے۔ (خطیب ج ۱۳ ص ۳۹۰-۹۱)

عقیقہ کرنا جاہلیت کے اعمال میں سے ہے

ابو بکر اثرم کہتے ہیں کہ ابو عبداللہ احمد بن حنبلؒ نے ہمارے سامنے عقیقہ کے باب میں رسول اللہ صلعم کی بہت سی حدیثیں، صحابہ کے آثار اور تابعین کے اقوال بیان کئے۔ پھر بطور تعجب کے مسکراتے ہوئے فرمانے لگے "مگر ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ یہ جاہلیت کے اعمال میں سے ایک عمل ہے۔ محمد بن یوسف بیکندی کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ کے سامنے امام ابو حنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا گیا کہ نکاح سے پہلے بھی طلاق دی جا سکتی ہے۔ امام احمد کہنے لگے مسکین ابو حنیفہ، گویا وہ عراق میں تھے ہی نہیں، گویا انھیں علم سے کچھ مس تھا ہی نہیں، اس باب میں رسول اللہ صلعم، صحابہ اور تیس کے قریب کبار تابعین، سعید بن جبیر۔ سعید بن المسیب، عطاء، طاؤس اور عکرمہ وغیرہ کے ارشادات اور اقوال موجود ہیں کہ نکاح سے پہلے طلاق نہیں پڑ سکتی۔ ابو حنیفہؒ ایسا کہنے کی جرأت کیونکر کرتے ہیں کہ طلاق پڑ جاتی ہے۔ (خطیب ج ۱۳ ص ۴۱۱)

آپ نے دیکھا کہ حدیث کے متعلق فقہ اسلامی کے سب سے بڑے امام کا مسلک کیا ہے۔ ان کی مدوّن فرمودہ یا ان کی طرف منسوب کردہ فقہ مسلمانوں کی اکثریت میں رائج ہے۔ لیکن ہمارے ہاں نہ تو امام اعظمؒ کو منکر حدیث کہا جاتا ہے اور نہ ہی حنفی مسلمانوں کو حالانکہ جس تشدد سے انکارِ حدیث امام ابو حنیفہؒ کے ہاں پایا جاتا ہے کسی "منکر حدیث" کے ہاں کم ہی ایسا پایا جاتا ہوگا۔ کم از کم طلوع اسلام میں ایسا تشدد آپ کو کبھی نظر نہیں آئیگا۔ لیکن اس کے باوجود طلوعِ اسلام کو منکر حدیث قرار دیکر کافر ٹھہرا دیا جاتا ہے اور حیرت یہ ہے کہ ایسا کہنے والے خود اپنے آپ کو حنفی کہتے ہیں اور فقہ حنفی کو بطور قانونِ مملکت پاکستان میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہ لوگ عوام کی جہالت سے کسقدر فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگر میں رسول اللہؐ کے عہد میں ہوتا تو آپ بھی میرے بہت سے اقوال کو اختیار فرما لیتے

امام اعظمؒ نے اپنے اس مسلک کی تائید میں دلائل میں بھی پیش کئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خود رسول اللہ صلعم کا طریقہ یہ تھا کہ آپ تعیین جزئیات (تدوین فقہ) میں

صحابہؓ سے مشورہ لیا کرتے تھے اور جسکی رائے بہتر معلوم ہوتی تھی اسے اختیار فرما لیا کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اگر میں بھی رسول اللہؐ کے زمانہ میں ہوتا تو میں بھی اس مجلس مشاورت میں شریک ہوتا اور میرا خیال ہے کہ کئی امور میں حضورؐ میری رائے کو اختیار فرما لیتے چنانچہ

محمود بن موسیٰ کہتے ہیں کہ میں نے یوسف بن اسباط سے سُنا کہ امام ابوحنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رسول اللہ صلعم مجھے پاتے اور میں آپ کو پاتا تو بہت سی باتوں میں یقیناً آپ میرے قول کو اختیار فرما لیتے اور ابو اسحٰق کو میں نے کہتے سنا ہے کہ ابوحنیفہؒ کے سامنے اکثر نبی صلعم کی حدیثیں آتیں اور وہ ان کی مخالفت کیا کرتے۔ (تاریخ خطیب ج ۱۳ ص ۳۸۷)

یوسف بن اسباط سے ابو صالح الفراء نے بھی اسی قول کو نقل کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:-

ابوحنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ نبی صلعم مجھے پاتے اور میں آپ کو پاتا (یعنی دونوں ایک زمانہ میں ہوتے) تو آپ میرے بہت سے اقوال کو اختیار فرما لیتے۔ دین اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ ایک اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے۔ (ایضاً ج ۱۳ ص ۳۹۰)

ہمارا خیال ہے کہ اس باب میں کسی مزید وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی طلوع اسلام بھی یہی کہتا ہے کہ مرکز ملت نمائندگان امت کے مشورہ سے قرآنی اصولوں کی روشنی میں جو فیصلے کرے وہ شریعت اسلامی کہلاتے ہیں اور یہ فیصلے زمانے کے حالات کے ساتھ ساتھ قابل تغیر و تبدل ہوتے ہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ جناب امام ابوحنیفہؒ اس عقیدہ کو رکھتے ہوئے متبع سنت قرار پائیں اور طلوع اسلام کو اسی عقیدہ کی بنا پر کافر ٹھہرا دیا جائے۔

جس چیز کا مدار نقل در نقل روایت پر ہو وہ دین نہیں بن سکتی

اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھیے۔ طلوع اسلام اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اس آسمان کے نیچے یقینی چیز اللہ کی کتاب ہے جس کی حفاظت کا ذمہ اس نے خود لے رکھا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس کی حیثیت تاریخ کی ہے۔ اور تاریخ یقینی نہیں بلکہ ظنی چیز ہوتی ہے۔ تاریخی امور میں اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے اور انکار بھی۔ اس اختلاف و انکار سے نہ دین پر حرف آتا ہے اور نہ ایسا کرنے والا کسی جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔ آپ دیکھئے کہ اس باب میں امام ابوحنیفہؒ کا کیا مسلک ہے "کعبہ" مکہ مکرمہ میں ہے اور محمد رسول اللہ صلعم کا مزار مقدس مدینہ منورہ میں واقع ہے۔ کیا کسی مسلمان کو بھی اس میں شبہ ہو سکتا ہے؟ حضور اکرم صلعم کے عہد سعادت عہد سے لیکر آج تک اس تسلسل اور تواتر کے ساتھ یہ دونوں باتیں نقل ہوتی چلی آ رہی ہیں کہ شاید ہی کوئی چیز نقل ہوئی ہو مگر بایں ہمہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کا مدار نقل در نقل روایات پر ہے۔ سنئے اس کے متعلق امام اعظم ابوحنیفہؒ کا ارشاد کیا ہے:-

حمزہ بن حارث بن عمیر اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے مسجد حرام میں ایک آدمی کو سنا جو امام ابوحنیفہؒ سے ایک شخص کے متعلق سوال کر رہا تھا جو یوں کہتا ہے کہ میں اسکی گواہی دیتا ہوں کہ کعبہ حق ہے مگر میں یہ نہیں جانتا کہ آیا کعبہ وہی ہے جو مکہ میں ہے یا کوئی اور ہے امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ یہ شخص سچا مومن ہے۔ پھر اسی آدمی نے ایک ایسے شخص کے متعلق سوال کیا جو یوں کہتا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد بن عبداللہ، اللہ کے نبی ہیں مگر میں یہ نہیں جانتا کہ آیا یہ وہی ہیں جنکی قبر مدینہ میں ہے یا کوئی اور

ہیں تو امام ابو حنیفہؒ نے کہا یہ شخص بھی سچا مؤمن ہے۔ حمیدی کہتے ہیں لیکن جو شخص ایسے کہتا ہے ہمارے نزدیک وہ کافر ہو جاتا ہے۔ (خطیب ج ۱۳ ص ۳۷۰-۷۱)

محمد بن محمد باغندی کہتے ہیں کہ مجھ سے میرے والد نے بیان کیا کہ میں عبداللہ بن الزبیر کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ان کے پاس امام احمد بن حنبلؒ کا خط آیا کہ مجھے امام ابو حنیفہؒ کا کوئی شنیع ترین قول لکھکر بھیجدو تو عبداللہ ابن الزبیر نے حارث بن عمیر کی روایت سے یہ مسئلہ لکھکر بھیجا کہ میں نے ابو حنیفہؒ کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ اللہ کا ایک گھر ہے لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ آیا وہ مکہ میں ہے یا کہیں اور ہے۔ تو کیا یہ شخص مومن ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے کہا "ہاں مومن ہے"۔ ایسے ہی اگر کوئی شخص یوں کہتا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ نبی صلعم کا انتقال ہو گیا ہے۔ لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ آیا وہ مدینہ میں دفن کئے گئے ہیں یا کہیں اور۔ تو کیا ایسا شخص مومن ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے کہا "ہاں مومن ہے"۔ (خطیب ج ۱۳ ص ۳۷۱)

دوسرے مقام پر ہے:۔

امام سفیان ثوریؒ کہتے ہیں کہ ہم سے عباد بن کثیر نے بیان کیا کہ میں نے ابو حنیفہؒ سے پوچھا کہ ایک آدمی ہے جو یوں کہتا ہے کہ "میں جانتا ہوں کہ کعبہ حق ہے اور وہ اللہ کا گھر ہے لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ وہ مکہ میں ہے یا خراسان میں ہے۔ کیا یہ شخص مومن ہے؟ امام ابو حنیفہؒ نے کہا "ہاں مومن ہے"۔ پھر میں نے پوچھا ایسے آدمی کے بارہ میں آپ کیا فرماتے ہیں جو یوں کہتا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ محمد صلعم اللہ کے رسول ہیں لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ آیا وہ وہی ہیں جو مدینہ میں تھے اور قریش کے خاندان سے تھے یا کوئی دوسرے محمد ہیں۔ تو کیا یہ شخص مومن ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے کہا کہ ہاں مومن ہے۔ مؤمل کہتے ہیں کہ یہ قول نقل کرنے کے بعد سفیانؒ نے کہا۔ اور میں کہتا ہوں کہ جو شخص اس بات میں شک کرے وہ کافر ہے (ایضاً ج ۱۳ ص ۳۷۲)

آپ نے غور فرمایا کہ تاریخ اور دین کا فرق کس قدر نمایاں طور پر واضح ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقامات ہیں جہاں امام اعظمؒ کی بالغ نظری جزرسی اور حقائق شناسی ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

یہاں تک آپ نے دیکھ لیا کہ حدیث کی دینی حیثیت کے متعلق صحابہؓ کا کیا مسلک تھا اور اس باب میں امام ابو حنیفہؒ نے کس طرح اس مسلک کی اتباع کی۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں اس زمانہ تک کوئی ایسا گروہ نمایاں طور پر سامنے نہیں آتا جو اس مسلک کے خلاف کسی دوسرے مسلک کا حامل ہو اور حدیث کو قرآنی احکام کی طرح غیر متبدل مانتا ہو۔ جہاں تک تاریخ ہماری رہنمائی کرتی ہے اس مسلک کے سب سے پہلے اور بڑے داعی امام شافعیؒ ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ حدیث قرآن کی تکمیل کرتی ہے اور اسی لئے قرآنی احکام کی طرح واجب الاتباع ہے۔ امام شافعیؒ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے (یعنی اسی سال جب امام اعظمؒ کی وفات ہوئی) اور انہوں نے ۲۰۴ھ میں مصر میں وفات پائی۔ یہ خاندان عباسیہ کی عظمت کا دور تھا چنانچہ امام موصوف نے ہارون الرشید، امین اور مامون الرشید کا زمانہ پایا۔ اس دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ امت میں دو گروہ سامنے آتے ہیں۔ ایک وہ جو صحابہؓ اور امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کا پابند تھا

ہر صحیح حدیث کا واجب التعمیل اور ناقابل تبدیل ہونا امام شافعیؒ کا مذہب ہے

یعنی جو احادیث کو غیر متبدل نہیں مانتا تھا اور دوسرا گروہ جو امام شافعیؒ کے مسلک کا پابند تھا اور حدیث کو ہمیشہ کے لئے واجب الاتباع خیال کرتا تھا۔ اب اول الذکر گروہ کو (جو اب تک صرف مسلمان کے لقب سے ملقب تھا) اصحاب الرائے کے نام سے مشہور کیا گیا اور دوسرا گروہ اصحاب الحدیث کے نام سے متعارف ہوا۔ امام شافعیؒ نے پہلے گروہ کے مسلک کی تردید اور اپنے مسلک کی تائید میں بہت کچھ لکھا اور وہ اپنے مخالفین کے ساتھ مناظرے بھی کرتے رہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کتاب "الام" کے ساتویں حصہ میں ایک باب باندھا ہے جس کا عنوان ہے۔

"اس جماعت کے اقوال بیان کرنے کا باب جس نے حدیثوں کو رد کر دیا"

اس کے بعد انھوں نے اس جماعت کے مسلک اور ان کے استدلال کو انہی میں سے ایک شخص کی زبانی اس طرح بیان کیا ہے:۔

انکار حدیث کے متعلق متکلمین اور اصحاب الرائے کے دلائل

"تم عربی ہو اور قرآن ان لوگوں کی زبان میں نازل ہوا ہے جن میں تم خود ہو اور تم کو وہ خوب یاد ہے اور اس میں خداوند تعالیٰ نے اپنے چند فرائض نازل کئے ہیں۔ اگر کوئی شخص جس پر قرآن مشتبہ ہو گیا ہو اس کے ایک حرف میں بھی شک کرے تو تم اس سے توبہ کا مطالبہ کرو گے اور اگر اس نے توبہ کر لی تو بہتر ہے ورنہ تم اس کو قتل کر دو گے۔ قرآن مجید کے بارہ میں خود خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے "تبیانا لکل شئ" یعنی وہ ہر چیز کی وضاحت ہے۔ ایسی حالت میں تمہارے یا اور کسی شخص کے نزدیک یہ کیونکر جائز ہے کہ خداوند تعالیٰ نے جس چیز کو فرض کر دیا اس کی نسبت کبھی یہ کہے کہ یہ فرض عام ہے۔ کبھی یہ کہ وہ خاص ہے، کبھی یہ کہ اس امر میں فرضیت ہے اور اس امر میں استحباب ہے اور اس قسم کے فرق اور بھی بہت سے ہیں۔

تمہارے پاس ایک حدیث یا دو حدیث یا تین حدیثیں ہوتی ہیں جن کو تم ایک آدمی سے پھر دوسرے سے پھر تیسرے سے روایت کر کے رسول اللہ صلعم تک پہنچاتے ہو اور میں نے تم کو اور تمہارے ہم مذہب لوگوں کو پایا ہے کہ تم نے جس سے ملاقات کی اور حفظ و صداقت میں اس کو مقدم سمجھا اور تمہارے ملنے والوں میں سے خود جس سے ملا تم ان میں سے کسی کو حدیث میں غلطی اور بھول چوک سے بری نہیں کرتے بلکہ میں نے تم کو ان میں سے متعدد اشخاص کی نسبت یہ کہتے ہوئے پایا ہے کہ فلاں نے اس حدیث میں اور فلاں نے اس حدیث میں غلطی کی۔ اور میں نے تم کو یہ کہتے ہوئے پایا ہے کہ اگر کوئی شخص ایسی حدیث کی نسبت جس کے ذریعہ سے تم نے کسی چیز کو حلال و حرام بتایا ہے (انکار کر دے، اور) کہے کہ یہ علم خاصہ سے ہے، رسول اللہ صلعم نے اس کو نہیں فرمایا ہے۔ صرف تم نے یا اس شخص نے غلطی کی ہے جس نے تم سے اس حدیث کو بیان کیا اور (یوں کہے کہ) تم نے جھوٹ کہا ہے، یا اس شخص نے (جھوٹ کہا ہے) جس نے تم سے اس حدیث کی روایت کی ہے تو تم اس سے توبہ کا مطالبہ نہیں کرتے اور اس سے زیادہ اس کو نہیں کہتے کہ "تم نے کسقدر برا کہا" تو کیا یہ جائز ہے کہ کوئی شخص قرآن مجید کے احکام اور اس کے ظاہر میں ایسے شخص کے نزدیک تفریق کرے جس نے اسکو ایسے شخص سے سنا ہے جس کی حالت وہ ہے جس کو تم نے بیان کیا ہے۔ اور ان کی احادیث کو تم کتاب اللہ کے قائم مقام قرار دیتے ہو اور ان سے حلال و حرام کرنے میں مدد لیتے ہو۔ لیکن جب تم نے ان کی

احادیث کو قبول کر لیا اور ان میں ایسے لوگ ہیں جن کی احادیث کو قبول کرنے کی نسبت تمہارا معاملہ وہ ہے جس کو میں نے بیان کیا اور جس شخص نے ان کو رد کر دیا ان کی نسبت تمہاری کیا حجت ہے؟ میں ان احادیث میں سے کسی کو قبول نہیں کرتا جبکہ ان میں وہم کا امکان ہے اور میں صرف اس کو قبول کرتا ہوں جس کے ذریعہ سے خدا پر گواہی دوں، جیسا کہ اس کی کتاب پر گواہی دیتا ہوں جس کے ایک حرف میں بھی کسی کو شک کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ کیا یہ جائز ہے کہ ایک چیز کو حاوی قرار دیا جائے اور وہ اسکی سزاوار نہ ہو۔ (تاریخ فقہ اسلامی ص۲۵۸-۶۰)

فتنۂ خلق قرآن نے کیونکر پانسہ پلٹ دیا

ممکن ہے کہ اس نئے گروہ کا مسلک (جس کے موجد امام شافعیؒ تھے) محض نظری مباحث تک ہی محدود رہتا لیکن بدقسمتی سے ماضی قریب میں ایک ایسا سیاسی فتنہ اٹھ چکا تھا جو عرصۂ دراز تک قائم رہا اور جس نے اس نزاع میں فریقین کا پانسہ پلٹ دیا اور اس کے بعد امت قرآن اور عقل دونوں کی برکتوں سے محروم ہو گئی۔ اس زمانہ میں ایک خالص نظری مسئلہ پیدا ہوا کہ کلام اللہ مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ ظاہر ہے کہ یہ خالص علم کلام کا مسئلہ تھا جو نظری بحث ہی کا موضوع بن سکتا تھا۔ لیکن چونکہ یہی مسئلہ امت کے فکر و عمل میں ایک بہت بڑے انقلاب کا موجب بن گیا اس لئے ضروری ہے کہ آپ اس کی تدریجی تاریخ کو سامنے لے آئیں۔

خونِ ناحق کی ندیاں

تاریخ کے اوراق سے پوچھئے کہ اس ایک سوال نے خون ناحق کی کس قدر ندیاں بہا دیں؟ دوسری صدی ہجری میں جعد بن درہم نے قرآن کے مخلوق ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس کی پیروی میں جہم بن صفوان نے اس کا اعلان کیا۔ کچھ علماء نے اس قول کو اسلام کے خلاف قرار دیا اور اس عقیدہ کے حاملین کو مرتد ٹھہرا دیا۔

امام ابوحنیفہؒ خلق قرآن کے قائل تھے

عقیدۂ خلق قرآن کے مؤیدین وہی لوگ تھے جو دین میں قرآن اور اجتہاد کے پابند تھے۔ ظاہر ہے کہ امام ابوحنیفہؒ بھی ان ہی کے ہم نوا تھے بلکہ بعض شہادات سے تو پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے انھوں نے ہی یہ کہا قرآن مخلوق ہے چنانچہ امام ابو یوسفؒ سے منقول ہے کہ

اول من قال ان القرآن مخلوق ابوحنیفۃ

سب سے پہلے جس شخص نے یہ اعلان کیا کہ قرآن مخلوق ہے وہ امام ابوحنیفہؒ ہیں۔

اس کی تائید بہت سی دوسری شہادات سے بھی ہوتی ہے جن کا تفصیلی ذکر خطیب نے اپنی تاریخ جلد ۱۳ ص۳۷۸-۳۸۰ میں کیا ہے۔

یہ حضرات اپنے خیال کی تائید میں قرآن اور عقلی دلائل پیش کرتے تھے فریق مخالف کے نزدیک اس کا توڑ یہی ہو سکتا تھا کہ لوگوں میں یہ مشہور کیا جائے کہ خود رسول اللہ صلعم قرآن کو غیر مخلوق مانتے تھے اور اس طرح لوگوں کے جذبات کو ابھار کر فریق مخالف کو شکست دیدی جائے۔ چنانچہ اس مضمون کی متعدد حدیثیں کہ القرآن کلام اللہ غیر مخلوق مختلف پیرایوں میں رسول اللہ صلعم سے روایت کی گئیں اور لوگوں میں پھیلائی گئیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حدیثیں قطعاً وضعی تھیں اسلئے کہ خلق اور قدم قرآن کا مسئلہ خالص علم کلام کا مسئلہ ہے

اور رسول اللہ صلعم کے زمانے میں عقائد پر علم کلام کی رو سے بحث ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ مسلمانوں میں علم کلام بہت بعد میں آیا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی حدیثوں کے زور پر ان لوگوں نے عوام میں اپنے آپ کو اس قدر مقبول ضرور بنا لیا تھا کہ رائے عامہ کے دباؤ سے وہ حکومت کو بھی متاثر کر سکتے تھے اور اپنے مخالفین کو بھی جا و بیجا طور پر مرعوب کر سکتے تھے۔ سلطنت کے مصالح کچھ اس قسم کے تھے کہ اس نے پہلے گروہ کی مخالفت اور دوسرے گروہ کی ہمنوائی کی چنانچہ خالد بن عبداللہ قسری والیٔ عراق نے جعد کو عید الاضحیٰ کے دن بطور قربانی کے ذبح کیا اور جہم کو سلمہ بن احوز نے مرو میں قتل کر ڈالا۔ اس طرح قتل و غارت کا وہ بازار گرم کیا کہ

امام ابوحنیفہؒ کو بار بار توبہ کرنا پڑی

امام ابوحنیفہؒ جیسے صاف گو اور جری شخص کو بھی دو تین مرتبہ اس خیال سے توبہ کرنا پڑی۔ چنانچہ خطیب نے اپنی تاریخ میں یحییٰ ابن حمزہ، سعید بن عبدالعزیز، یزید ابن زریع، سفیان ثوری، عبداللہ ابن ادریس اور اسد بن موسیٰ کی شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ امام صاحب نے دو مرتبہ اس عقیدہ سے توبہ فرمائی اور سفیان بن عیینہ سے نقل کیا ہے کہ تین مرتبہ توبہ فرمائی حتیٰ کہ ان لوگوں کے نام بھی نقل کئے ہیں جنھوں نے امام صاحب کو توبہ کرائی تھی۔ اس سلسلہ میں خالد بن عبداللہ قسری والیٔ عراق۔ یوسف بن عمر اور شریک بن عبداللہ قاضیٔ کوفہ کے نام نقل کئے گئے ہیں۔ (خطیب ص ۳۸۰-۸۳) اس مذہبی جنون و استبداد کی تفصیلات سے ہماری تاریخ کے صفحات آج تک رنگین ہیں۔

انقلاب رنگین

مامون الرشید کے عہد میں حالات نے پلٹا کھایا اور وہ خود اور اس کے درباری قرآن کے مخلوق ہونے کے قائل ہو گئے۔ اب دوسرے گروہ پر جن کا لقب اب اصحاب الحدیث قرار پا گیا تھا کفر کے فتوے لگنا شروع ہوئے اور وہ جرم ارتداد کی سزا میں قتل ہونے لگے۔ اکثر علماء نے مجبوراً قرآن کو مخلوق کہہ کر اپنی جانیں بچائیں۔ لیکن اکثر اپنے عقیدہ پر قائم رہ کر سخت ترین اذیتیں جھیلتے اور موت کے گھاٹ اترتے رہے۔ انہی میں امام احمد بن حنبلؒ جیسی شخصیت بھی تھی۔ امام صاحب کو جس طرح قید و بند کے عذاب میں مبتلا رکھا گیا اس کے تصور سے روح کانپتی ہے۔ انھیں دربار میں بلا کر کوڑوں سے پٹوایا جاتا تھا اور جب وہ بیہوش ہو جاتے تو پھر قید خانہ میں بھجوا دیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ ایک دن، دو دن نہیں بلکہ پورے اڑھائی سال تک جاری رہا۔ معتصم (مامون الرشید کا جانشین) ان سب لوگوں کو قتل کر دیا کرتا تھا جو قرآن کو غیر مخلوق کہتے تھے۔ معتصم کے جانشین، واثق نے بھی خون کی ان ندیوں میں اضافہ کیا حتیٰ کہ احمد بن نصر کو اسی عقیدے کی بنا پر خود اپنے ہاتھ سے قتل کر کے "ثواب عظیم" کا مستحق بنا۔ احمد کے جسم کو سامرا میں سولی پر چڑھایا گیا اور اس کے سر کو بغداد بھیجا گیا۔ کان میں ایک رقعہ لٹکایا گیا جس میں لکھا تھا:

یہ احمد بن نصر مشرک اور گمراہ کا سر ہے جس کو امیر المومنین نے بغرض تقرب الٰہی اپنے ہاتھ سے قتل کیا ہے۔

پھر دوسرا انقلاب

جب متوکل خلیفہ ہوا تو اس نے تمام صوبوں میں حکم بھیجا کہ کوئی شخص آئندہ قرآن کو مخلوق نہ کہے اس سے پھر پلڑا یکبارگی محدثین کی طرف جھک گیا۔ اب محدثین نے متکلمین اور اصحاب الرائے سے انتقام لینا شروع کیا۔ متوکل نے محدثین کی مدارات کے لئے انھیں سامرا میں بلا کر انعامات دیئے۔ جب سلطنت کی طرف سے بھی اس قسم کی

سرپرستی ہوئی تو عوام میں پھر ان کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی چنانچہ ان لوگوں نے ایک طرف متوکل کی اس قدر تعریف کی کہ اس بدتدبیر اور عیاش بادشاہ کو جس کے محل میں بقول ابوبکر خوارزمی بارہ ہزار حرم تھیں خلفائے راشدین کے ہم رتبہ قرار دیا اور دوسری طرف احتساب کو اپنے ہاتھ میں لیکر متکلمین اور اصحاب الرائے کا تعاقب شروع کر دیا اور جوش انتقام میں وہ مظالم روا رکھے گئے کہ چاند اور سورج کی آنکھ جن سے شرما جائے۔ مختصر یہ کہ چن چن کر متکلمین اور اصحاب الرائے کے سربرآوردہ حضرات کو قتل کیا گیا اور یہ سیلاب اس زور سے اُمڈا کہ ان غریبوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ رہا کہ وہ اپنی جماعتی حیثیت کو ختم کر کے اپنے آپکو محدثین میں جذب کر دیں اس طرح قرآن و اجتہاد کا وہ مسلک جو صحابہ کے زمانہ سے چلا آرہا تھا اور جسے امام ابوحنیفہؒ کے مجتہدانہ تفقہ نے اسقدر بلند کر دیا تھا خالص روایت پرستی میں تبدیل ہو گیا اور اس طرح امت عقل و بصیرت اور قرآن دونوں ہی سے محروم ہو گئی۔ عباسی حکومت کے اضمحلال کے ساتھ ساتھ علمی سردبازاری بھی شروع ہو چکی تھی اس لئے علمائے حنفیہ میں پھر کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کو علانیہ پیش کر سکے۔ شکست خوردگی کا یہ عالم ہوا کہ ان لوگوں نے اپنی حنفیت کے بقاء کیلئے شافعیت کے اصول میں پناہ لی اور اصولِ شافعیت کے مطابق فریق مقابل کی احادیث کو بلاوجہ ضعیف قرار دینے اور اپنے مسلک کے لئے موید حدیثوں کو صحیح قرار دینے پر سارا زور صرف کر ڈالا حتیٰ کہ بعض اوقات ضعیف اور موضوع روایتوں کے آسرے اپنے مذہب کو روایات ہی سے ثابت کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ چنانچہ علامہ محمد الخضری اسکی شکایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> لیکن جب شراح، حامیان اور نکتہ چینانِ مذاہب کا گروہ پیدا ہوا تو انھوں نے ان اصول کی طرف جن کو ان کے ائمہ نے اختیار کیا تھا توجہ نہیں کی اور اپنے مخالفین پر ہر صحیح السند حدیث کی مخالفت کا گو وہ ان کی شرائط کی جامع نہ ہو جن کو اس شخص نے شرط قرار دیا ہے جس پر وہ نکتہ چینی کر رہے ہیں الزام دینے لگے۔ اسی طرح وہ لوگ ہر حدیث کو جس کو ان کے امام نے قبول نہیں کیا اس کی سند پر نکتہ چینی کر کے یا اور کسی دوسرے ماخذ کے ذریعہ سے ضعیف کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ کہدینا آسان تھا کہ امام نے اس حدیث کو اس لئے قبول نہیں کیا کہ حدیث پر عمل کرنے کیلئے جس شرط کو اس نے اپنا اصول قرار دیا ہے وہ اس حدیث میں موجود نہ تھی۔ (تاریخ فقہ اسلامی ص۲۷۵)

متکلمین اور اصحاب الرائے کو بالکلیہ ختم کر دیا گیا اور امت قرآن و بصیرت سے محروم ہو گئی

اصحاب الرائے شافعی بن گئے

خلق قرآن کا مسئلہ تو ختم ہو گیا مگر اس کے زیر سایہ حدیث کے اقرار و انکار نے اپنی مستقل حیثیت پیدا کر لی۔ اب چونکہ محدثین کو بڑی تقویت حاصل ہو گئی تھی اس لئے انھوں نے امام ابوحنیفہؒ کو منکر حدیث قرار دیکر انھیں طرح طرح سے مطعون کرنا شروع کر دیا۔ یہ پروپیگنڈا اس شد و مد اور اس انداز سے کیا گیا کہ اصحاب الرائے کا مذہب شاید خالص الحاد اور زندقہ کا مسلک تھا۔ آپ ملاحظہ کیجئے کہ اس عہد کے مُلّا نے امام ابوحنیفہؒ کے خلاف بعینہٖ وہی کچھ کہا جو آج طلوع اسلام کے خلاف کہا جا رہا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ پر محدثین کا طعن و تشنیع

امام مالک بن انسؒ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ کا فتنہ اس امت کیلئے ابلیس کے فتنہ سے کم نہیں ہے۔ دونوں باتوں میں عقیدۂ ارجاء میں بھی اور احادیث کو رد کرنے میں بھی۔ عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں کہ میں دجال کے فتنہ کے بعد اسلام میں کسی فتنہ کو ابوحنیفہؒ کے فتنہ سے بڑا نہیں دیکھتا۔ (خطیب ج ۱۳ ص ۳۹۶) سلیمان بن حسان حلبی کہتے ہیں کہ میں نے بے شمار مرتبہ امام اوزاعی کو کہتے سنا ہے کہ ابوحنیفہ ح

امام ابوحنیفہؒ اسلام کے ایک ایک دستہ کو گن گن کر توڑ رہے تھے

نے اسلام کے ایک ایک دستہ کو گن گن کر توڑا ہے۔ ایسے ہی جب امام ابوحنیفہؒ کا انتقال ہوا تو امام اوزاعیؒ نے کہا خدا کا شکر ہے وہ اسلام کے ایک ایک دستہ کو توڑ رہا تھا عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں کہ میں سفیان ثوریؒ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ امام ابوحنیفہؒ کے انتقال کی خبر آئی تو سفیانؒ نے کہا خدا کا شکر ہے کہ اس نے مسلمانوں کو اس سے نجات دی۔ وہ اسلام کے ایک ایک دستہ کو توڑ رہا تھا۔ فزاری کہتے ہیں کہ میں نے سفیانؒ اور اوزاعی دونوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اسلام میں ابوحنیفہؒ سے زیادہ بدبخت ترین پیدا نہیں ہوا۔ امام شافعیؒ نے بدترین کا لفظ کہا ہے۔ قیس بن الربیع سے ابوحنیفہؒ کے متعلق دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ ماضی (روایات و آثار) کا جاہل ترین اور مستقبل (استنباط احکام) کا عالم ترین شخص ہے (ایضاً ج ۱۳ ص ۳۹۸)

امام ابوحنیفہؒ کی مخالفت ہی حق ہے

عمرو بن قیس کا قول ہے کہ جو شخص حق کو معلوم کرنا چاہے اسے کوفہ جا کر ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے قول کو دیکھنا چاہیئے۔ اس کے بعد ان اقوال کے خلاف کرنا چاہیئے (کیونکہ وہی حق ہے) عمار بن زریق کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ کی مخالفت کرو، تم حق کو پالوگے۔ بشری کہتے ہیں کہ تم اگر ابوحنیفہ کی مخالفت کروگے تو حق کو پالوگے۔ ابن عمار کہتے ہیں کہ جب تمہیں کسی بات میں شک ہو تو دیکھ لو کہ ابوحنیفہؒ نے کیا کہا ہے بس اس کی مخالفت کرو کہ حق وہی ہوگا، یا یوں کہا کہ اسکی مخالفت ہی میں برکت ہے۔ (ایضاً ج ۱۳ ص ۴۰۸)

مسجد میں امام ابوحنیفہ کا نام لینا جرم تھا

ابوعبید کہتے ہیں کہ میں اسود ابن سالم کے ساتھ رصافہ کی جامع مسجد میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں کسی مسئلہ کا تذکرہ آگیا۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ اس بارہ میں ابوحنیفہ ایسا ایسا کہتے ہیں تو اسود نے مجھے ڈانٹ کر کہا کہ تو مسجد میں ابوحنیفہؒ کا تذکرہ کرتا ہے۔ اور مسجد میں ابوحنیفہؒ کا نام لے دینے کے جرم میں وہ مجھ سے اس قدر ناراض ہوئے کہ مرتے دم تک پھر مجھ سے کلام نہیں کیا۔ (ایضاً ص ۴۰۹ ج ۱۳)

سفیانؒ نے ہشام بن عروہ سے انھوں نے اپنے والد سے یہ حدیث نقل کی کہ بنی اسرائیل کا معاملہ اعتدال پر قائم تھا حتیٰ کہ ان میں لونڈی بچوں کا غلبہ ہو گیا جنھوں نے دین میں رائے کو دخل دیا۔ خود بھی گمراہ ہوئے اور لوگوں کو بھی گمراہ کر دیا۔ اس کے بعد سفیانؒ نے کہا کہ اسلام میں بھی لوگوں کا معاملہ اعتدال پر قائم تھا حتیٰ کہ اسے ابوحنیفہؒ نے کوفہ میں، عثمان بتی نے بصرہ میں اور ربیعہ ابن ابی عبدالرحمٰن نے مدینہ میں بدل ڈالا۔ ہم نے غور کیا تو ان سب کو ہم نے لونڈی بچے ہی پایا۔ (خطیب ج ۱۳ ص ۳۹۴)

فقہ حنفی دجّالوں کا کلام ہے

حمدویہ بن خالد کہتے ہیں کہ محمد بن مسلمہ مدینی سے پوچھا گیا "کیا وجہ ہے کہ ابوحنیفہؒ کی رائے سارے شہروں میں گھس گئی ہے مگر مدینہ منورہ میں داخل نہیں ہو سکی؟" محمد بن مسلمہ نے جواب دیا "اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے کہ مدینہ منورہ کی ہر گلی پر ایک فرشتہ مقرر ہے جو مدینہ میں دجال کو داخل ہونے سے روکے گا۔ اور یہ بھی چونکہ دجّالوں ہی کا کلام ہے اسلئے وہاں داخل نہیں ہو سکا۔ (الیٰ ج ۱۳ ص ۳۹۶)

امام ابوحنیفہؒ حدیث میں یتیم اور گونگے تھے

ابن اسحٰق ترمذی کہتے ہیں کہ عبداللہ بن المبارک نے کہا ابوحنیفہ حدیث میں بالکل یتیم تھے۔ مرجّح بن یونس نے ابوقطن سے نقل کیا ہے کہ اگرچہ ابوحنیفہؒ نے ہم سے حدیث بیان کی ہے مگر وہ حدیث میں گونگے تھے۔ ابن نمیر کہتے ہیں کہ میں نے لوگوں کو اس پر متفق پایا ہے کہ وہ رائے تو رائے ابوحنیفہؒ کی حدیث پر بھی اعتماد نہیں کرتے تھے۔ حجاج بن ارطاۃ کہتے ہیں کہ "ابوحنیفہؒ کون تھا؟ ابوحنیفہؒ کی بات کون قبول کرتا ہے؟ ابوحنیفہؒ تھا ہی کب!؟" علی ابن المدینی کہتے ہیں کہ یحیی ابن سعید قطان کے سامنے ابوحنیفہ کا ذکر آ گیا اور ان سے ابوحنیفہؒ کی حدیث کے متعلق سوال کیا گیا تو یحیٰی نے کہا "وہ حدیث والے تھے ہی کب"؟ محمد بن حماد مقری کہتے ہیں کہ میں نے یحیٰی بن معین سے ابوحنیفہ کے متعلق سوال کیا تو یحیٰی نے کہا "ان کے پاس حدیثیں تھی ہی کتنی کہ تم ان کے متعلق پوچھتے ہو؟" ابوبکر ابن شاذان کہتے ہیں کہ مجھ سے ابوبکر ابن ابی داؤد نے کہا کہ ابوحنیفہؒ نے کل ایک سو پچاس حدیثیں نقل کی ہیں۔ اس میں سے بھی آدھی حدیثوں میں غلطی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ نہ ثقہ تھے نہ مامون

مؤمل کہتے ہیں کہ سفیان ثوریؒ کے سامنے ابوحنیفہ کا ذکر آیا۔ سفیان ثوریؒ اس وقت حطیم کعبہ میں تھے (یعنی طواف کر رہے تھے) سفیان نے کہا کہ ابوحنیفہ نہ ثقہ تھے نہ مامون تھے اور وہ اپنے ان الفاظ کو برابر دہراتے رہے تا آنکہ ان کا طواف ختم ہو گیا۔ (خطیب ج ۱۳ ص ۴۱۵-۱۷)

مندرجہ بالا آراء کو سامنے رکھئے اور غور کیجئے کہ یہ کن لوگوں کی رائیں ہیں اور کس کے متعلق ہیں۔ ان میں کا ہر شخص علم حدیث اور علم رجال کا ستون تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان اساتین سنت کا یہ کچھ فیصلہ تو خود امام ابوحنیفہؒ کے متعلق تھا۔ اب دیکھئے کہ امام ابوحنیفہؒ کے دونوں اولوالعزم شاگرد ان رشید یعنی حضرت امام ابویوسفؒ اور امام محمد کے متعلق یہ حضرات کیا رائے رکھتے ہیں۔ مگر آگے بڑھنے سے پہلے اتنی بات ذہن نشین کر لیجئے کہ فقہ حنفی میں خود امام ابوحنیفہؒ کی کوئی کتاب ہم تک نہیں پہنچی۔ ہم تک جو کچھ پہنچا ہے وہ ان ہی دونوں حضرات صاحبین کی وساطت سے پہنچا ہے۔

امام ابویوسفؒ کے متعلق ائمہ رجال کی رائے

عبدالرزاق بن عمر کہتے ہیں کہ میں عبداللہ بن المبارک کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک آدمی نے آ کر عبداللہ بن المبارک سے کوئی مسئلہ پوچھا۔ عبداللہ نے اس کو فتوی دیا۔ وہ شخص کہنے لگا کہ میں نے یہی مسئلہ ابویوسف سے بھی پوچھا تھا مگر انھوں نے آپ کے خلاف فتوٰی دیا ہے۔ عبداللہ ابن المبارک نے کہا "اگر تو نے ابویوسف کے پیچھے کچھ نمازیں پڑھی ہوں جو تجھے یاد ہوں تو جا کر فوراً ان نمازوں کو دہرا لو۔ (خطیب ج ۱۴ ص ۲۵۷)

ابو یوسف جھوٹے اور فاسق تھے

عبدہ بن عبداللہ خراسانی کہتے ہیں کہ کسی نے عبداللہ ابن المبارک سے پوچھا کہ ابو یوسف اور محمد میں زیادہ سچا کون ہے؟ عبداللہ ابن المبارک نے کہا یوں نہ کہو بلکہ یوں پوچھو کہ زیادہ جھوٹا کون ہے؟ اس آدمی نے کہا اچھا یوں ہی بتائیے۔ عبداللہ نے کہا کہ ابو یوسف! (ایضاً)

عبداللہ ابن ادریس کہتے ہیں کہ ابو حنیفہؒ ایک گمراہ اور گمراہ کن شخصیت تھے اور ابو یوسف فاسقوں میں سے ایک فاسق تھے (ایضاً)

امام ابو یوسف نے امام ابو حنیفہ پر جھوٹ باندھے

محمد بن اسماعیل بخاریؒ (صاحب الصحیح) فرماتے ہیں کہ ہم سے نعمان (امام ابو حنیفہؒ) کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ تم لوگوں کو یعقوب (امام ابو یوسفؒ) پر تعجب کیوں نہیں آتا۔ اس نے مجھ پر اسقدر جھوٹ باندھ دیئے ہیں جو میں نے کبھی نہیں کہے۔ (ایضاً ج ۱۳ ص ۲۵۸)

ابو نعیم فضل بن دکین کہتے ہیں کہ میں نے خود ابو حنیفہؒ کو ابو یوسف سے یہ کہتے سنا ہے "تمہارا ستیاناس ہو، ان کتابوں میں تم لوگ مجھ پر کتنا جھوٹ باندھ رہے ہو جو میں نے کبھی نہیں کہا۔ (ایضاً)

ابن ابی شیبہ اور ابن الغلابی یحییٰ بن معین سے نقل کرتے ہیں کہ ابو یوسف قاضی کو حدیث کی کوئی پہچان نہیں تھی تاہم وہ ثقہ ہیں (ایضاً ص ۲۵۹)

احمد بن حنبلؒ کہتے ہیں کہ اگرچہ میں نے سب سے پہلے ابو یوسف ہی سے حدیثیں لکھی ہیں مگر میں ان کی حدیثیں بیان نہیں کرتا۔ نیز فرمایا کہ اگرچہ ابو یوسف سچے ہیں مگر ابو حنیفہؒ کے اصحاب میں سے کسی سے بھی احادیث بیان نہیں کرنی چاہئیں۔

ابوالحسن (امام) دارقطنی سے ابو یوسف کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ وہ محمد بن الحسن کی نسبت زیادہ قوی ہیں مگر اندھوں میں کانے ہیں۔ امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ کہتے ہیں کہ یعقوب بن ابراہیم ابو یوسف قاضی کو محدثین نے ترک کر دیا ہے (خطیب ج ۱۴ ص ۲۵۹-۲۶۰)

امام محمد بن الحسن کے متعلق ائمہ رجال کی رائے

امام احمد بن حنبلؒ کہتے ہیں کہ یعقوب ابو یوسف تو حدیث کے ساتھ موصوف تھے مگر ابو حنیفہ اور محمد بن الحسن دونوں احادیث نبویؐ کے مخالف تھے۔ ان دونوں کی رائے بڑی ہی خراب تھی یعنی ابو حنیفہ اور محمد بن الحسن کی۔ (خطیب ج ۲ ص ۱۷۹)

امام محمد کذاب تھے

یحییٰ بن معین سے محمد بن الحسن کے متعلق سوال کیا گیا تو انھوں نے بتایا کہ "محمد بن الحسن کذاب ہے"۔ ایسے ہی ایک مرتبہ یوں کہا کہ "ضعیف ہے"۔ کبھی فرمایا "وہ تو کچھ بھی نہیں ہے اس کی حدیث نہیں لکھی جاتی" (ایضاً)

امام ابوداؤد سجستانی کہتے ہیں کہ محمد بن الحسن شیبانی کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کی حدیث نہیں لکھی جاتی۔ (ایضاً ج ۲ ص ۱۸۱)

امام ابوالحسن دارقطنی کہتے ہیں کہ محمد بن الحسن شیبانی صاحب ابو حنیفہؒ کو یحییٰ بن معین اور امام احمد بن حنبل نے کذاب کہا ہے مگر میرے نزدیک وہ بالکل ہی چھوڑ دینے کے قابل نہیں ہیں۔ (ایضاً ج ۲ ص ۱۸۱)

امام محمد نے امام ابو یوسف پر جھوٹ باندھے

بشر بن الولید کہتے ہیں کہ ابو یوسفؒ نے کہا "ذرا اس کذاب یعنی محمد بن الحسن سے پوچھو کہ جو کچھ وہ مجھ سے نقل کرتا ہے وہ کبھی اس نے مجھ سے سنا بھی ہے؟

(ایضاً ج ۲ ص ۱۸۰)

یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ میرے سامنے محمد بن الحسن سے پوچھا گیا کہ کیا ان کتابوں کو جنھیں تم نقل کرتے ہو تم نے ابو یوسف سے سنا ہے؟ تو محمد نے جواب دیا کہ "نہیں، خدا کی قسم میں نے ان کو ابو یوسف سے نہیں سنا۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ میں ان کتابوں کو سب لوگوں سے زیادہ جانتا ہوں۔ اور میں نے تو ابو یوسف سے صرف جامع صغیر سنی ہے۔ (ایضاً)

حنفی کیونکر اہلحدیث بن گئے

ان تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ حدیث کے معاملہ میں امام ابوحنیفہؒ کا کیا مسلک تھا اور اس مسلک کی بنا پر انھیں اور ان کے اصحاب کو روایت پرست حضرات کی بارگاہ سے کیا کیا القاب عطا ہوئے تھے۔ نیز یہ حقیقت بھی کہ ان کے مسلک کے پیرو حضرات کو کس طرح روایت پرست حضرات کے طوفانِ مخالفت اور مذہبی استبداد بلکہ جنون سے تنگ آکر خود انہی کے سایہ میں پناہ لینی پڑی اور حنفی فقہ کی جزئیات کو خود مخالفین کے اصول کے مطابق کھینچ تان کر کے خواہ موضوع اور ضعیف روایات سے ہی کیوں نہ سہی مگر روایات ہی سے ثابت کرنا پڑا۔ ان کیلئے زبانی اہل حدیث بنے بغیر کوئی چارۂ کار ہی نہیں رہا تھا ورنہ متکلمین کی طرح اصحاب الحدیث کے ہاتھوں ان لوگوں کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی جانوں یا اپنے مسلک سے ہاتھ دھو لینے پڑتے۔

فقہ حنفی کی مقبولیت

لیکن اس تمام طوفان بدتمیزی کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امت کی اکثریت کا مسلک فقہ حنفی ہی کے مطابق رہا اور حنفی مسلمان اس وقت تک اہلحدیث سے الگ فرقہ کی حیثیت سے موجود چلے آتے ہیں اور نہ صرف موجود ہیں بلکہ اکثریت میں ہیں اور اس فقہ کا اس وقت تک بھی ایسا اثر ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو سب سے بڑے متبع سنت اور مؤید حدیث قرار دیتے ہیں وہ بھی آج اس قسم کی کوشش کر رہے ہیں کہ ملک کا قانون فقہ حنفی کے مطابق ہونا چاہئے اور اہلحدیث کا گروہ ان کے خلاف ایک لفظ بھی زبان پر نہیں لا سکتا ــــ کہیں تاریخ پھر اپنے آپ کو دھرا تو نہیں رہی ــــ کہ اہل حدیث نے جو کچھ واثق باللہ کے زمانہ کے بعد حنفیوں کے ساتھ کیا تھا اب حنفیوں کی طرف سے اس کے جواب کا موقعہ آیا ہے؟ ــــ بہرحال یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ آج بھی یہ حقیقت ہر جاننے والے پر واضح ہے کہ اگرچہ اہلحدیث اور حنفی اپنے آپ اہلسنت والجماعت کہتے ہیں لیکن حدیث کے معاملہ میں احناف کا مسلک باوجود علماء حنفیہ کی مداہنت اور کم ہمتی کے اہل حدیث سے بالکل مختلف ہے۔

حدیث کا زبانی اقرار مگر عملاً انکار

اگرچہ احناف، حدیث کے معاملہ میں ظاہراً طور پر اپنی فقہ کے مؤسس امام اعظم ابوحنیفہ کے مسلک کے متبع نہیں رہے لیکن حدیث کو قبول کرنے کیلئے خود ان کی اصول کی کتابوں میں جو شرائط مذکور ہیں وہ اہل حدیث کی شرائط سے بالکل مختلف ہیں۔ فرق یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے حدیث کے رد میں اپنے مسلک کا کھلم کھلا اعلان کیا لیکن آج ان کے متبعین اگرچہ عملاً اپنی فقہ میں حدیث کو وہی حیثیت دیتے ہیں لیکن اپنی زبان سے وہ کچھ کہنے کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتے جو امام ابوحنیفہؒ کہہ گئے ہیں۔ یہ زبان سے حدیث کا اقرار تو کرتے ہیں لیکن اس طرح کہ جب حدیث پر عمل کرنے کا سوال سامنے آئے تو یا تو کوئی حدیث ان کی شرائط پر پوری ہی نہ اترے اور یا ضعیف اور موضوع حدیثوں کی آڑ لیلی جائے۔ یہ لوگ اس حربہ سے منکرین حدیث بننے کے الزام سے تو بچ جاتے ہیں لیکن اتنا نہیں سوچتے کہ جس امام کی طرف یہ اپنے آپ کو منسوب

کرتے ہیں یہ روش ان کی روش کے کسقدر خلاف جاتی ہے۔ طلوع اسلام حرفاً حرفاً اس مسلک کی طرف دعوت دیتا ہے جو درحقیقت امام ابوحنیفہؒ کا مسلک تھا لیکن جس مسلک کے علانیہ اقرار کی جرأت آج امام ابوحنیفہؒ کے متبعین اپنے اندر نہیں پاتے۔

صحیح حدیث کی قسمیں جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ صحیح حدیث کی چار قسمیں ہیں خبر واحد، جسکو روایت کرنے والا کسی زمانہ میں صرف ایک آدمی رہ جائے۔ خبر عزیز، جسے روایت کرنے والے کسی زمانہ میں صرف دو آدمی مل سکیں۔ خبر مشہور جسے نقل کرنے والے کسی زمانہ میں کم از کم تین آدمی رہ جائیں۔ خبر متواتر جسے عام طور پر لوگ عام طور پر لوگوں سے روایت کریں اور وہ روایت کرنیوالے اتنے کثیر التعداد ہوں کہ عقل ان کے جھوٹ بولنے پر اتفاق کرنے کو ممکن تصور نہ کرے۔

مجموعہ ہائے روایات زیادہ تر اخبار آحاد پر مشتمل ہیں خبر متواتر کے متعلق محدثین میں خود اختلاف ہے کہ آیا اس کا وجود ہے بھی یا نہیں جو لوگ اس کے وجود کے مدعی ہیں وہ بھی اس کی تعداد ایک یا دو سے زیادہ نہیں بتاتے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے انما الاعمال بالنیات والی روایت، اور کچھ لوگوں نے مسح علی الخفین کی روایت کے متعلق تواتر کا دعویٰ کیا ہے۔ اور بس۔ مشہور احادیث بھی گنتی کی ہیں زیادہ تر ہمارے مجموعہ ہائے روایات میں اخبار آحاد ہی ہیں۔

حنفیہ کے ہاں صرف متواتر حدیث ہی اصولاً قابل قبول ہے حنفیہ کے ہاں حسب تصریح علمائے اصول صرف متواتر حدیث قابل قبول ہے۔ متواتر کے علاوہ اور کوئی حدیث قابل قبول نہیں ہے۔ علامہ محمد الخضری رقم طراز ہیں:-

> بعض لوگوں کا قول ہے کہ رسول اللہ صلعم سے کوئی روایت صرف اس صورت میں قبول کی جاسکتی ہے (۱) جبکہ اس کو عام طور پر لوگ عام طور پر لوگوں سے روایت کریں۔ اور (۲) فقہائے امصار متفقاً اس پر عامل ہوں۔
>
> اور اس نے پہلی وجہ پر ایک تیسری وجہ کا ایک اضافہ اور یہ کیا ہے کہ (۳) جب رسول اللہ صلعم سے آپ کا کوئی صحابی آپ کے کسی فیصلہ کی روایت کرے اور کوئی دوسرا صحابی اس کی مخالفت نہ کرے تو ہم اس سے دو باتوں پر استدلال کرینگے۔ ایک تو یہ کہ اس نے صحابہ کی جماعت میں اس حدیث کی روایت کی۔ دوسری یہ کہ اسکی مخالف کسی دوسری حدیث سے انھوں نے اس لئے نہیں کی کہ وہ جانتے تھے کہ یہ حدیث ویسی ہی ہے جیسے کہ وہ روایت کرتا ہے۔ اسلئے وہ عام صحابہ کی حدیث قرار پائیگی۔
>
> فقہائے عراق یعنی امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا رجحان اسی طریقہ کی طرف ہے۔ (تاریخ فقہ اسلامی ص۲۶۵)

آگے بڑھنے سے پہلے ذرا اس رائے کا ماحصل اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے اس رائے کا حاصل یہ ہوا کہ رسول اللہ صلعم سے کوئی روایت صرف اسی صورت میں قبول کی جاسکتی ہے۔

(۱) جبکہ اسے عام طور پر لوگ عام طور پر لوگوں سے روایت کریں۔

(۲) فقہائے امصار متفقہً اس پر عامل ہوں۔

(۳) جو صحابی اس کو بیان کر رہا ہو وہ صحابہ کے مجمع میں اس کو بیان کرے اور کوئی صحابی اس کی مخالفت نہ کرے حتیٰ کہ وہ عام صحابہ

کی حدیث قرار دی جا سکے۔

کیا حضرات علمائے حنفیہ تکلیف فرما کر بتائیں گے کہ ان شرائط کے مطابق ان کے مجموعہ ہائے روایات میں کتنی حدیثیں ہیں؟

اس جملۂ معترضہ کے بعد ہم پھر علامہ محمد الخضری کے اقتباس پر آتے ہیں اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:-

"اور امام ابو یوسفؒ نے سیر الاوزاعیؒ کی تنقید میں جو کتاب لکھی ہے اور امام شافعیؒ نے "کتاب الام" میں جس کی روایت کی ہے، اس کے باب "سوار اور پیادہ کے حصۂ مال غنیمت میں" اسی معنی کی توضیح کی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ "**تم صرف اس حدیث کو لو جو عام طور پر لوگوں کو معلوم ہو**، اور شاذ حدیث کو (جسے صرف چند آدمی روایت کریں) چھوڑ دو۔ کیونکہ ہم سے ابن ابی کریمہ نے انھوں نے ابو جعفر سے اور انھوں نے رسول اللہ صلعم سے حدیث بیان کی ہے کہ آپ نے یہود کو بلایا اور انھوں نے آپ سے حدیث بیان کی یہاں تک کہ حضرت عیسیٰؑ پر جھوٹ باندھا اس کے بعد رسول اللہ صلعم منبر پر چڑھ گئے اور لوگوں کے سامنے خطبہ دیا کہ **عنقریب مجھ سے حدیث پھیلے گی تو میری جو حدیث قرآن کے مطابق تم کو ملے وہ تو میری حدیث ہے لیکن جو قرآن کے مخالف ہو وہ میری حدیث نہیں**۔ مسعر بن کدام اور حسن بن عمارہ نے عمرو بن مرہ سے، انھوں نے بحتری سے اور انھوں نے علیؓ بن ابیطالب سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ جب تمہارے پاس رسول اللہ صلعم کی حدیث آئے تو یہ خیال کرو کہ وہ بہت زیادہ ہدایت کرنے والی، بہت زیادہ صاف اور بہت زیادہ زندہ کرنیوالی ہے۔ اشعث بن سوار اور اسماعیل بن ابی خالد نے شعبی سے اور انھوں نے قرظہ ابن کعب انصاریؓ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں انصار کے ایک گروہ میں کوفہ کی طرف چلا تو عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے پاپیادہ ہماری مشایعت کی، یہاں تک کہ ہم ایک مقام پر جس کا انھوں نے نام بتایا پہنچے تو انھوں نے فرمایا کہ اے گروہ انصار! تم کو معلوم ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیوں پاپیادہ آیا؟ ان لوگوں نے کہا "ہاں، ہمارے حق کی وجہ سے"۔ بولے "تمہارا حق یہی ہے لیکن تم ایسی قوم کے پاس جاتے ہو جن کے ہاں شہد کی مکھیوں کی طرح قرآن کی گنگناہٹ ہے۔ تو تم رسول اللہ صلعم سے بہت کم روایت کرو اور میں تمہارا شریک ہوں"۔ قرظہؓ نے کہا کہ "میں کبھی **رسول اللہ صلعم سے روایت نہ کرونگا**"۔ ہم کو روایات سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت عمرؓ دو گواہوں کے بغیر رسول اللہ صلعم سے حدیث کو قبول نہیں کرتے تھے۔ اور اگر کتاب طویل نہ ہو جاتی تو میں تمہارے لئے بسند حدیث بیان کرتا حضرت **علی بن ابیطالبؓ رسول اللہ صلعم کی حدیث ہی کو قبول نہیں کرتے تھے**۔ روایتیں بہت زیادہ بڑھتی جاتی ہیں اور ایسی روایتیں نکلتی آتی ہیں جو نامعلوم ہیں۔ اہل فقہ ان کو نہیں جانتے اور وہ کتاب و سنت کے موافق نہیں ہیں۔ تو تم شاذ[1] حدیث سے (جسے چند آدمی نقل کرتے ہوں) احتراز کرو اور وہ حدیث لو

---

[1] یہاں شاذ اور مشہور حدیث کے لفظ سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے جیسا کہ خود علامہ محمد الخضری کو دھوکہ ہو گیا ہے۔ اس وقت تک محدثین کی ان اصطلاحات کا ظہور ہی نہیں ہوا تھا اسلئے وہ مشہور کے لفظ کو اپنے عام معنوں میں استعمال کرتے تھے نہ کہ اصطلاحی معنوں میں۔ لہٰذا شاذ سے مراد وہ احادیث ہیں جنھیں صرف چند لوگ بیان کریں اور مشہور سے مراد یہاں حدیث متواتر ہی ہے یعنی خود امام ابو یوسف کے الفاظ میں جو عام طور پر لوگوں کو معلوم ہو یعنی جسے عام طور پر لوگوں نے عام طور پر لوگوں سے روایت کیا ہو اور جس پر جماعت کا اتفاق عام ہو اور اس کو فقہا جانتے ہوں۔ ۱۲

جس پر جماعت کا اتفاق عام ہو اور اسکو فقہا رجانتے ہیں۔ تو اور چیزوں کو اسی پر قیاس کرو۔ اور جو چیز قرآن کے مخالف ہو گو اس کی روایت کی جائے لیکن وہ رسول اللہ صلعم کی حدیث نہیں ہے۔ ہم سے معتبر لوگوں نے رسول اللہ صلعم سے روایت کی ہے کہ آپ نے اپنے مرض الموت میں فرمایا کہ میں صرف اس چیز کو حرام کرتا ہوں جس کو قرآن نے حرام کیا ہے اور مشہور[1] حدیث کو تمہارا رہنما اور امام بناتا ہوں اسکا اتباع کرو اور قرآن و حدیث میں جسکی توضیح نہ کی گئی ہو وہ اگر پیش آئے تو اسی پر قیاس کرو۔ الخ۔ (تاریخ فقہ اسلامی ص۲۶۵-۶۷)

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ حدیث کو قبول کرنے کیلئے امام ابو یوسف کی کیا شرطیں ہیں۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کے متعلق امام احمد بن حنبل کا یہ قول پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ ابو یوسف تو موصوف بالحدیث تھے مگر ابو حنیفہ اور محمد بن الحسن دونوں احادیث نبوی کے مخالف تھے۔ ان دونوں کی رائے بڑی خراب تھی یعنی ابو حنیفہؒ اور محمد بن الحسن کی (خطیب ج۲ ص۱۷۹) نیز عمرو الناقد کا ارشاد ہے کہ میں اصحاب الرائے میں سے کسی سے بجز ابو یوسف کے روایت کرنا پسند نہیں کرتا کیونکہ ابو یوسف صاحب سنت تھے (ایضاً ص۲۵۳ ج۱۴) اور بقول امام دارقطنی کے اندھوں میں کانے ہیں۔ (ایضاً ص۲۶ ج۱۴) صرف ان اقوال کو سامنے رکھ کر بھی حقیقت تک پہنچ جانا اور امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کا صحیح مسلک معلوم کر لینا آپ کے لئے کچھ مشکل نہیں ہے تاہم جیسا کہ علامہ محمد الخضریؒ نے کوشش فرمائی ہے اگر بر سبیل تنزل یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ امام ابو حنیفہ اور ان کے تمام اصحاب کا یہی مسلک تھا جو بروایت امام شافعیؒ امام ابو یوسف نے مصرح طور پر بیان کیا ہے تب بھی حضرات حنفیہ کے نزدیک ایک دو حدیثیں ہی قابل قبول ہو سکتی ہیں وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ ان حضرات نے کہیں بعض محدثین کے اس فیصلہ کو صراحۃً تسلیم کیا ہو کہ ایک یا دو متواتر حدیثیں موجود ہیں اور ان کا وجود عنقا کے وجود کی طرح عالم خیال ہی کی پیداوار نہیں ہے۔

فقہ حنفی ابد الآباد تک کیلئے ناقابل تغیر نہیں تھا

اب ایک آخری بات رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ کیا امام اعظمؒ کا یہ منشا تھا کہ وہ اپنی فقہ کو قیامت تک کے لئے غیر متبدل قرار دیں؟ ظاہر ہے کہ جس شخص کا عقیدہ یہ ہو کہ خود رسول اللہ صلعم کے فیصلے بھی قیامت تک کیلئے غیر متبدل قرار نہیں دیئے جا سکتے وہ کبھی خود اپنے فیصلوں کے متعلق یہ کہہ سکتا ہے کہ انھیں قیامت تک کے لئے غیر متبدل سمجھا جائے؟ اس باب میں بھی تاریخی شہادات موجود ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ نے اس بات کو بھی شدت سے روکا کہ ان کے اجتہادات کو ابدی حیثیت دیدی جائے۔ چنانچہ:

فقہ حنفی کے متعلق امام ابو حنیفہؒ کی تصریحات

نضر بن محمد کہتے ہیں کہ ہم امام ابو حنیفہؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے اور ہمارے ساتھ ایک شام کا آدمی بھی ہوتا تھا۔ جب وہ شامی (فراغت کے بعد) وطن کو واپس جانے لگا تو امام ابو حنیفہؒ سے رخصت ہونے کیلئے آیا۔ امام ابو حنیفہؒ نے اس سے پوچھا "اے شامی! کیا تم اس کلام (فقہ) کو بھی اپنے ساتھ شام کی طرف لے جاؤ گے؟" شامی نے جواب دیا "ہاں"۔ اس پر امامؒ نے فرمایا "خیال رکھنا تم بہت بڑے شر کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہو۔ (خطیب ج۱۳ ص۴۰۱) مزاحم بن زفر کہتے ہیں کہ میں نے خود امام ابو حنیفہؒ سے سوال کیا کہ جو کچھ آپ فتوے دیتے ہیں یا اپنی کتابوں میں درج فرماتے ہیں کیا یہ سب حق ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں؟ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا "بخدا مجھے معلوم نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ باطل ہو اور اس کے باطل ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ ہم امام ابو حنیفہؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ ہمارے ساتھ ابو یوسف اور محمد بن الحسن بھی

[1] گذشتہ صفحہ کا حاشیہ دیکھئے

ہوتے تھے۔ جو کچھ امام ابوحنیفہؒ فیصلے فرماتے ہم ان کو لکھ لیا کرتے تھے۔ امام زفرؒ کہتے ہیں کہ ایک دن امام ابوحنیفہؒ نے ابو یوسفؒ سے فرمایا "یعقوب! تیرا ناس ہو، جو کچھ تو مجھ سے سنتا ہے اسے سب کا سب نہ لکھ لیا کر۔ آج میری کچھ رائے ہوتی ہے اور کل میں اسے چھوڑ دیتا ہوں کل میری کچھ رائے ہوتی ہے اور پرسوں میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ ابونعیم کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ کو ابو یوسفؒ سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ سے کوئی مسئلہ نقل نہ کرو کیونکہ بخدا مجھے خبر نہیں کہ میں (اپنے اجتہاد میں) خطا کار ہوں یا مصیب (ایضاً) سہل بن مزاحم کہتے ہیں کہ میں اکثر امام ابوحنیفہؒ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنتا تھا (فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ) یعنی اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو بشارت دیدو جو باتوں کو سنتے ہیں اور پھر ان میں جو اچھی بات ہوتی ہے اس کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ (ایضاً ۳۵۲/۱۴۳) حسن بن زیاد لؤلؤی کہتے ہیں کہ میں نے خود امام ابوحنیفہؒ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "ہمارا یہ قول (فقہ) ایک رائے ہے جو بہتر سے بہتر ہم قائم کر سکے ہیں جو ہمارے قول سے بہتر رائے لا سکے تو وہی صحت سے زیادہ قریب ہوگی۔ (ایضاً)

ظاہر ہے کہ امام موصوف کی ان تصریحات کے بعد کہ وہ خود بھی اپنی فقہ کو شک و شبہ سے بالا اور غلطی و خطا سے مبرا نہیں سمجھتے تھے ہمارے لئے کہاں تک یہ مناسب ہو سکتا ہے کہ ہم انکی آراء کو وحی الٰہی کا مقام دیدیں اور خطا و غلطی سے بری قرار دیکر قیامت تک کیلئے امت کا دستور العمل بنا دیں۔

تصریحات بالا کو ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے۔ آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ تھا کہ:-

(i) دین میں غیر متبدل صرف قرآن کے احکام اور اصول ہیں اور یہی کتاب ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے۔

(ii) روایات تاریخی حیثیت کی حامل ہیں جن سے اجتہاد میں مدد تو لی جا سکتی ہے مگر مستقل دین کی حیثیت سے ان کو ناقابل تبدیل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

(iii) قرآن کے اصول کی روشنی میں اپنے اجتہاد سے فقہ مرتب کرنی چاہئے لیکن یہ اجتہادات بھی قیامت تک کیلئے غیر متبدل قرار نہیں دیئے جا سکتے۔

بعینہٖ یہی وہ مسلک ہے جسکی دعوت طلوع اسلام دیتا چلا آرہا ہے۔ وہ لوگ جو اپنے آپ کو حنفی کہتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی طلوع اسلام کے اس مسلک کی مخالفت کرتے ہیں اور اسے ہدف طعن و تشنیع بناتے ہیں، ذرا سوچیں کہ ان کی اس طعن و تشنیع کی زد کہاں تک پہنچتی ہے؟

اسکے بعد ذرا یہ بھی سوچئے کہ طلوع اسلام جس مسلک کی دعوت دے رہا ہے آیا حضرات صحابہ اور اجلۂ تابعین خصوصاً امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا یہی مسلک تھا یا طلوع اسلام کوئی نیا دین پیش کر رہا ہے۔ اگر ان تصریحات کے بعد بھی ہمارے ملا کو اصرار ہے کہ طلوع اسلام پھر بھی ایک نیا دین ہی تصنیف کر رہا ہے تو اس کے جواب میں ہم صرف امام احمد بن حنبلؒ کے ایک اقتباس پر اکتفا کرتے ہیں:-

ابراہیم حربی کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ نے علم میں ایسی بہت سی چیزیں داخل کر دی ہیں جن سے خالی پانی کو جانا زیادہ اچھا ہے۔ میں نے ایک روز ابوحنیفہؒ کے کچھ مسائل امام احمد بن حنبلؒ کے سامنے پیش کئے تو وہ تعجب کرنے لگے اور کہنے لگے "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابوحنیفہؒ تو بالکل ہی ایک نیا اسلام تصنیف کر رہے ہیں۔ (خطیب ج ۱۳ ص ۴۱۳)

وکفیٰ بہ اسوۃً۔

اتنا اور واضح رہے کہ ہم خدانخواستہ اپنے مسلک کو اسلئے صحیح نہیں سمجھتے کہ یہ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے بلکہ خود امام ابوحنیفہؒ کے مصرحہ بالا مسلک کو اسلئے صحیح سمجھتے ہیں کہ وہ مسلک قرآن کے مطابق ہے کہ یہی اس آسمان کے نیچے غلط اور صحیح کا معیار ہے۔

بے حجابی

جو صورتیں نظر آتی ہیں نوعِ انساں کی
کھچی ہیں جذبِ زن و مرد سے یہ تصویریں

بقائے نسل کا باعث ہے اس کشش کا وجود
اسی اساس پہ ہیں زندگی کی تعمیریں

جب اختلاطِ زن و مردِ عام ہو جائے
تو ٹوٹ جاتی ہیں جذب و کشش کی زنجیریں

زیانِ جذبِ یقینی ہے بے حجابی میں
الگ ہیں دل کی خطائیں نظر کی تقصیریں

جب اس کشش میں کسی طرح سے کمی آجائے
تو کرنی پڑتی ہیں اس کی کچھ اور تدبیریں

تھیٹر اور سینما، شراب و رقص و سرود
ہوس فروز فسانے، برہنہ تصویریں

جو سُرخرو نظر آتے ہیں بے حجابی میں
ملے گا خونِ تمنا جو اُن کا دل چیریں

معاشرت میں ہیں اُن کی خرابیاں جتنی
ہیں بیشتر اسی بے پردگی کی تاثیریں

خوشی سے کیجئے مغرب کی پیروی لیکن
رہیں نگاہ میں فطرت کی سخت تعزیریں

اسد ملتانی

حدیث
مثلہ معہ
کی حقیقت

(مولانا علامہ تمنا عمادی)

[قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ نبی اکرم صلعم کو وحی کے ذریعے دیا تھا وہ قرآن کے اندر محفوظ و مصئون ہے۔ اور قرآن کے باہر خدا کی وحی کہیں نہیں۔ لیکن مولوی صاحبان کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کے ساتھ قرآن کے ہم پایہ کچھ اور بھی ہے اسے روایات کا مجموعہ کہتے ہیں۔ اس عقیدہ کے متعلق "طلوع اسلام" بابتہ جنوری ۱۹۵۱ء میں (ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے جواب میں) تفصیلی بحث کی جا چکی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ یہ عقیدہ خالص عجم کی سازش کی پیدا کردہ ہے اور اس سے دین کی اصل و بنیاد متزلزل ہو جاتی ہے۔ علامہ تمنا عمادی نے زیر نظر مضمون میں اس حدیث پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے جس کی بنا پر یہ عقیدہ قائم کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح یہ حدیث عجمی سازش کا نتیجہ ہے۔ عمادی صاحب کی تحقیقات فنی اعتبار سے بڑی درخور ستائش ہوتی ہیں اور یہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ (طلوع اسلام)]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

و

بحمدہٖ

حَدِیْثُ مِثْلُہٗ مَعَہٗ وَمَنِ اخْتَلَقَہٗ وَوَضَعَہٗ

قرآن مبین سے باہر دین کا کوئی حکم نہیں ہے،

قرآن مبین کا یہ دعویٰ ہے کہ ما فرطنا فی الکتب من شیٔ[6] اس کتاب میں ہم نے کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے"۔ اور ارشاد ہے ونزلنا علیک الکتب تبیانا لکل شی (16/19) "ہم نے اس کتاب کو تم پر اتارا ہے دین کی ہر بات کو واضح طور سے بیان کر دینے کیلئے"۔ تبیان کے معنی ہیں کسی بات کو وضاحت کے ساتھ بیان کرنا۔ احکام دین اور اوامر و نواہی کے لئے کتاب اللہ کی صاف و صریح آیتیں ہی رکھی گئیں جو حضرت جبرئیل امینؑ کے ذریعے رسول تک پہنچتی رہیں۔ ابتدائے نزول سے ختم نزول تک جن کی کتابت، جن کے حفظ اور روزانہ کی تلاوت اور تعلیم و تعلم کا سلسلہ بلاناغہ رات دن تمام صحابہ میں رہا۔ اسی طرح اُن آیات کا ایک ایک حرف ہر طرح محفوظ رہا۔ کتاب اللہ کی حفاظت کا جو وعدہ کیا گیا ہے انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون۔ (15/9) "ہم نے اسی نصیحت کی کتاب کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"۔ تو اس سے مراد اوراق یا حروف و نقوش کی حفاظت نہیں ہے بلکہ اصل دین کی حفاظت کا وعدہ مقصود ہے۔ اگر دین ہی محفوظ نہ رہا تو کتاب رہی تو کیا اور نہ رہی تو کیا کتاب تو دین ہی کی تعلیم کیلئے آتی ہے اسلئے اس کتاب کی حفاظت کے معنی ہی یہ ہیں کہ دین

ہر طرح محفوظ رہے۔ اسی لئے دین کے تمام احکام، سارے اوامر و نواہی اسی کتاب میں محصور رکھے گئے اور اسی کتاب کو "تبیاناً لکل شئ" فرمایا گیا۔ اگر قرآن سے باہر حدیثوں میں بھی بعض ایسے احکام، بعض ایسے اوامر و نواہی، اور بعض ایسے حلال و حرام ہیں جن کا تعلق قرآن سے کچھ نہیں، یعنی قرآن مبین ان کے متعلق اثبات و نفی دونوں حیثیت سے بالکل خموش ہے۔ تو پھر قرآن کا یہ دعویٰ کہ یہ کتاب تبیاناً لکل شئ دین کی ہر بات بیان کرنے کیلئے اتری ہے اور اس میں کسی طرح کی کمی نہیں چھوڑی گئی" یہ دونوں دعوے غلط ہو جاتے ہیں۔ معاذ اللہ من ذلک۔ ومن اصدق من اللہ قیلا۔ اللہ سے بڑھکر بات کا سچا کون ہو سکتا ہے؟

وحی تشریعی صرف قرآن ہے

وہ وحی جس کا تعلق احکام شریعت دینی اوامر و نواہی اور حلال و حرام سے یا تبشیر و تنذیر سے ہے وہ صرف قرآن مبین اور اس کی آیتیں ہیں۔ جیسا کہ خود قرآن ہی میں فرمایا گیا ہے کہ قل اللہ شھید بینی و بینکم واوحی الی ھذا القرآن لانذرکم بہ ومن بلغ (۶/۱۹) "کہدو (اے رسول!) کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے، اور میری طرف یہی قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعے ہم تمہیں (نتیجۂ کفر سے) ڈراویں، اور جس کے پاس یہ پہنچ جائے اس کو بھی"۔ اور فرمایا گیا آخر سورۂ ق میں وذکر بالقرآن من یخاف وعید (۵۰/۴۵) جو میری دھمکیوں سے ڈرتا ہو اس کو قرآن کے ذریعے نصیحت کرو۔ تو خیال کیجئے کہ تذکیر و تنذیر تک میں قرآن ہی کا پابند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رکھا گیا اسلئے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے الفاظ میں بھی لوگوں کو دینی باتیں سمجھاتے ہوں گے تو قرآنی ہی مضامین بیان فرماتے ہوں گے۔ کیونکہ آپ کو قرآن ہی کی تبلیغ و تبیین اور قرآن ہی کے مطابق تنذیر و تذکیر کا حکم تھا۔ تو جب تبیین و تنذیر و تذکیر میں قرآن کی پابندی تھی تو پھر قرآن سے باہر اوامر و نواہی اور حلال و حرام بیان کرنے کی اجازت کب ہو سکتی ہے؟ اور کہاں سے ہو سکتی ہے؟

صحیح حدیثیں

اسی لئے حدیثوں کی صحت کا اصلی اور قطعی معیار مطابقت قرآن مبین ہے اسلئے کہ یہ ناممکن ہے کہ قرآن میں کچھ فرمایا جائے اور حدیث میں کچھ اور وارد ہو۔ جس رسول پر قرآن کا اتباع فرض ہو وہ قرآن کے خلاف کس طرح بول سکتے ہیں؟ اور قرآن سے باہر دینی احکام کیا اپنے جی سے بیان فرمائیں گے؟ جبکہ دینی احکام قرآن سے باہر ہو ہی نہیں سکتے۔ اسی لئے حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تکثر لکم الاحادیث بعدی فما روی لکم حدیث عنی فاعرضوہ علی کتاب اللہ فما وافقہ فاقبلوہ وما خالفہ فردوہ۔ "میرے بعد حدیثوں کی بڑی کثرت ہوگی تو جو حدیث میری طرف منسوب کر کے تمہارے سامنے روایت کی جائے۔ اس کو کتاب اللہ کے سامنے پیش کرو۔ اگر اس کے موافق ہو تو قبول کرو اور اگر اس کے خلاف ہو تو رد کرو۔ یہ حدیث صحیح بخاری میں پہلے موجود تھی، بعد کو یارانِ طریقت نے دیکھا کہ اس حدیث سے تو سینکڑوں حدیثیں غلط اور قابلِ رد ٹھہر جائیں گی، اسلئے اس حدیث کو بخاری کے نسخے سے نکال پھینکا مگر قدیم کتابوں میں بخاری کے حوالے سے یہ حدیث موجود ہے۔ چنانچہ توضیح و تلویح جو اصول فقہ حنفی کی نہایت مشہور و معروف کتاب ہے اور تقریباً تمام عربی مدارس کے نصاب تعلیم میں داخل ہے۔ اس میں بخاری کے حوالے سے یہ حدیث مذکور ہے۔ اس پر علامہ تفتازانی نے کچھ خفگی کا بھی اظہار کیا ہے مگر بخاری کی روایت کا اعتراف کرتے ہوئے۔ پھر سید السندؒ نے علامہ تفتازانی کا جواب بھی اپنے حاشیہ میں دیا ہے، اور اس حدیث کی صحت کیلئے اسی کو کافی

بتایا ہے کہ اس کو امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں درج فرمایا۔ غرض اُن بزرگوں کے وقت تک یہ حدیث صحیح بخاری میں موجود تھی۔ صحیح بخاری کے علاوہ مسند امام احمد میں، جاحظ کی کتاب البیان ج ۲ ص ۱۴ میں، تفسیر ابن جریر طبری ج ۲۵ ص ۶ میں، ملا جیون کی تفسیر احمدی میں اور شیعوں کی سب سے پہلی اور سب سے زیادہ مستند کتاب حدیث "اصول کافی" میں بھی موجود ہے تھوڑے تھوڑے الفاظ کے فرق کے ساتھ۔[1]

اسلئے صحیح حدیثیں وہی ہیں جو قرآن کے مطابق ہوں جو حدیث بھی خلافِ قرآن ہو چاہے وہ کیسے ہی قوی سے قوی اور اعلیٰ سے اعلیٰ اسناد سے کیوں نہ مروی ہو اور کتنے ہی طرق سے اسکی روایتیں آئی ہوں یقیناً اس کے وہ تمام طرق موضوع و مکذوب ہیں۔

سکوتِ قرآن کہا جاتا ہے کہ جو حدیث قرآن کے موافق ہو تو وہ تو فریقین کے نزدیک صحیح ہے اور جو حدیث قرآن کے مخالف ہو وہ فریقین کے نزدیک غلط اور موضوع۔ مگر تیسری قسم کی ایسی حدیث بھی ہو سکتی ہے جو ایسے مضامین پر مشتمل ہو جن سے قرآن خاموش ہے اسلئے ایسی حدیثیں اگر قرآن کے موافق نہیں ہیں تو مخالف بھی تو نہیں ہیں۔

مگر یہ سخت دھوکا ہے۔ اگر وہ حدیثیں دینی احکام، شرعی اوامر و نواہی اور حلال و حرام کے متعلق نہیں ہیں یعنی غیر تشریعی ہیں اور درایت کے بھی خلاف نہیں تو غیر تشریعی ہونے کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ وہ صحیح ہوں۔ تو غیر تشریعی حدیثیں ہمارا موضوع بحث نہیں ہیں۔ اور اگر دینی احکام اور حلال و حرام سے ان کا تعلق ہے اور ایسے احکام اور ایسے حلال و حرام بیان کر رہی ہیں جن سے قرآن خاموش ہے تو ایسی حدیثیں ضرور قرآن کے خلاف ہیں۔ ایک موٹی بات تو یہی ہے کہ قرآن جس مسئلے میں خاموش ہے حدیث اگر قرآن کے موافق ہے تو اس کو بھی خاموش ہی رہنا چاہیئے۔ ایسی جگہ حدیث کا زبان کھولنا ضرور قرآن کی مخالفت ہے۔[2]

مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان حدیثوں کو قرآن کے اس دعوے سے انکار ہے کہ قرآن دین کی تمام باتوں کو بیان کر دینے کیلئے اُتارا گیا ہے۔ اور یہ کہ دین کی باتوں میں قرآن نے کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے۔ اگر وہ احکام جن کے متعلق قرآن خاموش ہے اور حدیث بیان کر رہی ہے اگر دینی احکام ہیں تو ضرور قرآن میں ان احکام کی کمی رہ گئی اور تمام دینی باتوں کو قرآن نے بیان نہیں کیا اس لئے ایسی حدیثیں بھی ضرور قرآن کے خلاف ہی سمجھی جائیں گی۔ کیونکہ یہ حدیثیں دراصل قرآن کو ناقص ثابت کرنے کیلئے اور اس کے دعوی جامعیت کو غلط قرار دینے کیلئے منافقین و ملحدین نے گھڑی ہیں۔ ایسی ناپاک باتیں نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں تو کیا ہونگی کسی سچے ایماندار مومن کا بھی قول نہیں ہو سکتیں۔ محدثین اپنی روایت پرستی کے جذبے سے مغلوب ہو کر ان حدیثوں کے معنوی فساد اور اندرونی فتنوں کو نہ سمجھ سکے اور ان کو اپنے جذبۂ روایات پرستی کے لئے بزعم خود سند و حجت سمجھتے ہوئے ان کو اپنی کتابوں میں درج کرنے لگے۔ اور باوجود ان کے راویوں کی مجروحیت، مضامین کے اضطراب اور قرآن مبین کی صریح مخالفت کے ان کو اپنے استدلال و استنباط کیلئے غنیمت اور بہت غنیمت سمجھنے لگے۔ چنانچہ خطیب بغدادی نے اپنی کتاب "کفایہ" کے شروع میں اس قسم کی تقریباً تمام حدیثیں جو ان کو ملیں ان کے تعدد طرق کے ساتھ سب جمع کر دی ہیں۔ بہت مناسب ہے اگر میں اس جگہ ان سب حدیثوں کی تنقید نہایت دیانتداری کے ساتھ کر کے دکھا دوں اور یہ بھی بتا دوں کہ ان جھوٹی حدیثوں کو کہاں کہاں کے وضاعین و کذابین و منافقین نے گھڑا اور کہاں کہاں سے اور کن کن جگہوں سے ان کی اشاعت ہوئی۔

---

[1] الحمد للہ علیٰ ذلک التحقیق۔ [2] سبحان اللہ ایدک اللہ بروح منہ۔

منافقین کے مراکز

منافقینِ عجم نے جھوٹی اور مفسدانہ حدیثیں گھڑنے کیلئے اور اسلام کے خلاف مسلسل جدوجہد جاری رکھنے کے لئے جو مراکز بنا رکھے تھے ان میں سب سے پہلا مرکز تو خراسان تھا۔ پھر دوسرا مرکز کوفہ اور تیسرا مرکز شام بنا۔ ایرانی ملکوں میں نیشاپور بھی ایک وقت میں اچھا خاصہ مرکز ان منافقین کا رہا ہے مگر آخر میں مستقل اور سب سے بڑا مرکز کوفہ ہو گیا۔ اور حلقۂ اشاعت شام و عراق کے قصبے اور سیستان عراق میں واسط اور بصری کوفہ کے بعد۔ اور خراسان میں مرو، موصل اور شام کے درمیان نصیبین۔ شام کے شہروں میں حمص میں بہت پیش پیش رہا اور پھر دمشق، قیساریہ، فلسطین اور مَصِیصَہ وغیرہ ان منافقین کی خاص خاص اشاعت گاہیں تھیں۔ قدیمی ٹکسال تو خراسان اور اس کے مشہور قصبے مثلاً مرو وغیرہ تھے اور نیشاپور، بخارا اور پھر کوفہ، بعد کو ٹکسال بنتے گئے۔ مگر کوفہ چونکہ اس طبقے کے اکابر کا آخر میں مرجع بن گیا اس لئے سب سے بڑی ٹکسال کوفہ ہی بن کر رہا۔ مگر شام کے علاقہ میں حمص، مصیصہ دمشق وغیرہ میں بھی ٹکسال کا انتظام ضرور تھا۔ ٹکسالوں میں جھوٹی جھوٹی حدیثیں باہمی صلاح و مشورہ سے گھڑی جاتی تھیں اور اشاعت گاہوں سے ان کی اشاعت کا سلسلہ جاری کیا جاتا تھا۔ یہ ایک زبردست سازش کے ماتحت سلسلۂ جدوجہد تھا جس میں ہزاروں آدمی کام کر رہے تھے۔ خاص منافقینِ عجم تو تابعین کے زمرے میں داخل ہو کر عامۂ مسلمین میں اپنا کافی رسوخ پیدا کر چکے تھے جن کی تعداد کئی سو سے کم نہ ہوگی۔ مگر ان کے تلامذہ و ذریات جو تبع تابعین سمجھے جاتے تھے وہ شام و عراق و مصر میں بہت کافی پھیلے ہوئے تھے جن میں منافقین کی تعداد تو کم تھی مگر وہ منافقین کے تربیت یافتہ تھے اسلئے منافقین عجم کے برابر آلۂ کار بنے رہے اور ان کی گھڑی ہوئی حدیثوں کو صحیح سمجھ کر ان کی اشاعت ایک دینی خدمت سمجھ کر تا زندگی کرتے رہے۔

حدیث مثلہٗ معہٗ

ابوبکر خطیب بغدادی (ولادت ۳۹۲ھ متوفی ۴۶۳ھ) نے اپنی کتاب کفایہ کے ص۸ سے ص۱۲ تک اس حدیث کے جتنے طرق ان کو ملے ان سب کو جمع کر دیا ہے۔ اور ایک باب ہی اس کا اس عنوان سے باندھا ہے:

باب ما جاء فی التسویۃ بین حکم کتاب اللہ تعالیٰ وحکم سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی وجوب العمل ولازم التکلیف

یعنی یہ باب ہے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ دونوں کے حکم کی حیثیت سے برابر ہونے میں اور وجوب عمل اور تکلیف شرعی کے عائد و لازم ہونے میں یکساں ہونے میں۔

جہاں تک نفس مضمون کا تعلق ہے وہ تو بالکل صحیح ہے اسلئے کہ سنت رسول اللہؐ کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ کتاب اللہ کے احکام کی تعمیل جس طرح خود رسولؐ نے کی اور رسولؐ کی تعلیم کے مطابق صحابہؓ نے کی تو سنت رسول اور اصل قرآن کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ قرآنی احکام کی عملی تفسیر کا نام سنت رسول ہے۔ اسلئے سنتِ رسول کا اتباع عین قرآن کا اتباع ہے۔ جس طرح قرآن میں ارشاد فرمایا گیا:

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (۴/۸۰)

جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

تو جس طرح اللہ کی اطاعت رسول ہی کی اطاعت کر کے ممکن ہے اسی طرح قرآن کا اتباع سنت صحیحۂ رسول کا اتباع کر کے ہی ممکن ہے۔ مگر یہاں تو مراد ہی کچھ اور ہے۔ ہر حدیث مروی کو سنت قرار دیکر تمام حدیثوں کو حکم و وجوب عمل میں قرآن کا ہم پلہ بنانا ان کا مقصود ہے جیسا کہ اس باب کی حدیثوں سے ظاہر ہے اسلئے اس باب میں جو حدیثیں جمع کی گئی ہیں ان کو دیکھئے اور عبرت حاصل کیجئے۔

طرقِ روایات یہ حدیث مختلف الفاظ و عبارت میں طول و مختصر متعدد طُرق سے پانچ صحابیوں سے اور ایک تابعی سے مرسلاً مگر مرفوعاً مروی ہے۔

(۱) حضرت مقدام بن معدی کرب الکندی الشامی سے جو شام ہی میں رہے اور شام ہی میں ۸۷ھ میں ۹۱ برس کی عمر میں راہی جنت ہوئے۔ ان سے دس طرق سے مروی ہے۔

(۲) حضرت ابو رافع مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کوفہ میں رہے اور بقول صحیح حضرت علی مرتضیٰؓ کے زمانۂ خلافت میں جنت کو سدھارے ان سے چھ طرق سے مروی ہے۔

(۳) حضرت عرباض بن ساریہؓ جو اصحاب صُفّہ میں سے تھے اور شام میں آکر رہ گئے تھے اور شام ہی میں ۷۵ھ میں وفات پائی۔ ان سے صرف ایک ہی طریق سے مروی ہے۔

(۴) حضرت جابر بن عبداللہ الخزرجی السلمی الانصاری، جن کے سال وفات کے متعلق بہت اختلاف ہے۔ ۷۳ھ ۷۴ھ ۷۷ھ ۷۸ھ اور ۹۴ھ یہ سب لوگوں نے لکھا ہے۔ ابن عبدالبر نے استیعاب میں ۷۴ھ یا ۷۸ھ لکھا ہے۔ مدینہ میں وفات پائی۔ ان سے دو طریق مروی ہیں۔

(۵) حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی دو طریق مروی ہیں، ایک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول کہکر اور دوسرا حضرت فاروق اعظمؓ کی طرف منسوب ہے۔

(۶) چھٹا قول علقمہ بن قیس الکوفی کا ہے جس کو مرفوعاً یعنی رسول اللہ صلعم کی طرف منسوب کرکے انھوں نے روایت کیا ہے۔ حالانکہ رسول اللہ صلعم کی حیات ہی میں مگر جس سال آپ کی وفات ہوئی ہے اسی سال ان کی پیدائش ہے اسلئے بلاواسطہ ان کی روایت مرسل ہے متصل نہیں۔ ان کی وفات اور عمر میں بہت سے اقوال ہیں ۶۲ھ ۶۳ھ ۶۵ھ ۷۲ھ ۷۳ھ سب لوگ لکھ گئے ہیں اور نوے برس کی عمر بتائی ہے جو کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتی۔ جب ۱ھ یا ۲ھ میں ان کی ولادت ہے اور زیادہ سے زیادہ ۷۳ھ میں ان کی وفات ہے تو ان کی عمر ۷۳ برس کی ٹھہرتی ہے۔ بہرحال ان سے صرف ایک طریق مروی ہے۔

ان بائیس[۲۲] طرق میں سے گیارہ طرق تو خطیب بغدادی کی کتاب کفایہ میں ہیں اور دو طرق سنن ابوداؤد میں، اور دو ترمذی میں اور دو ابن ماجہ میں۔ اور دو سنن دارقطنی میں اور تین مسند امام احمد میں۔ بہت مناسبت کے ساتھ ان کتابوں میں یہ حدیثیں داخل کی گئیں۔

قابل غور نکتہ یہ حدیثیں اکابر صحابہ مہاجرین و انصار سے مروی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرات خلفائے راشدین اور اجلہ صحابہؓ اس حدیث سے بالکل بے خبر تھے۔ جو صحابہ شام ہی میں رہے اور وہیں وفات پائی، یا کوفہ میں رہے یا اصاغر صحابہؓ سے یہ حدیثیں روایت کی گئی ہیں۔ حضرت جابر بن عبداللہ اس قدر کم عمر تھے کہ جنگ بدر و جنگ احد میں شرکت سے ان کو ان کے والد نے روک دیا تھا اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ تو وفات نبویؐ کے وقت زیادہ سے زیادہ ۱۳ برس کے تھے۔

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ امام مالکؒ کی موطا اور صحیح بخاری و صحیح مسلم یہ تین کتابیں جو علمائے حدیث کے نزدیک سب سے زیادہ معتبر ہیں ان روایتوں سے بالکل خالی ہیں۔ خطیب بغدادی کو نیشاپور میں یہ حدیثیں ملیں۔ مگر امام مسلم جو خود نیشاپوری تھے

ان حدیثوں سے بالکل بے خبر رہے۔

آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جس طرح اکابر صحابہ ان حدیثوں سے بالکل بے خبر رہے اسی طرح اکابر محدثین بھی ان حدیثوں سے بے خبر ہی رہے۔

مسند احمد کے متعلق تو میرا مضمون "التاریخ المستند لمسند الامام احمد" "البیان" بابت ماہ اکتوبر و ماہ نومبر ۱۹۴۶ء میں چھپ چکا ہے کہ یہ ساٹھ ہزار حدیثوں کا مجموعہ دراصل امام احمد بن حنبلؒ کے بہت بعد ایک جماعت وضاعین وکذابین نے مل کر مرتب کیا تھا اس کو امام احمد بن حنبل یا ان کے صاحبزادے عبداللہ سے کوئی سروکار نہیں۔ اسلئے مسند احمد میں ان حدیثوں کے ہونے سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے وہ تو موضوعات ومکذوبات کا خزانہ ہی ہے اگر اس میں یہ حدیثیں نہ ہوتیں تو تعجب ہوتا۔ بلکہ اس پر تعجب ہے کہ عرباض بن ساریہ والی روایت مسند احمد میں نہیں ہے۔ جابر بن عبداللہ والی حدیث ہے اور نہ ابن عباس والی۔ حالانکہ بعض اکابر محدثین کا قول ہے کہ جو حدیث مسند احمد میں نہ ہو سمجھ لو کہ وہ مشتبہ ہے اسلئے کہ تمام کے ذخائر اس میں مجتمع ہیں۔

مشکوٰۃ میں بھی عرباض بن ساریہ کی حدیث نقل کی ہے اور ابوداؤد کا حوالہ دیا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ ابوداؤد کے متداول نسخوں میں یہ حدیث باوجود کافی جستجو کے نہیں ملی۔ مگر خود صاحب مشکوٰۃ لکھتے ہیں کہ ابوداؤد کے سلسلۂ روایت میں اشعث بن شعبۃ المصیصی کا نام بھی آتا ہے اور ان کے متعلق ائمہ رجال کو کلام ہے۔ یہ اشعث صاحب خراسانی ہیں۔ شام کے مشہور قصبہ مصیصہ[1] میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ حافظ ازدی نے ان کو ضعیف الحدیث لکھا ہے۔ اسی کی طرف صاحب مشکوٰۃ نے اشارہ کیا ہے۔

متن حدیث ان بائیس طرق کی ہر حدیث کو معہ اسناد لکھنا اور ان کا ترجمہ پیش کرنا بہت طوالت طلب ہے۔ اسلئے چونکہ ان تمام طرق میں سب سے زیادہ روایتیں حضرت مقدام بن معدی کرب سے مروی ہیں اسلئے انھیں سے جو سب سے بڑی اور مکمل حدیث روایت کی گئی ہے میں اسی کو نقل کرکے اس کا ترجمہ کردیتا ہوں۔ باقی حدیثوں کو اسی پر قیاس کرلیجئے۔ اختلاف الفاظ واضطراب مضامین کو کہاں تک دکھاؤں گا۔ نفس مضمون حدیث کے اختلاف واضطراب سے قطع نظر کرکے صرف ان کے راویوں کو دیکھئے۔ اسی قدر ایک دیانتدار انصاف پسند کے سمجھنے کیلئے کافی ہے۔ تو حضرت مقداد سے یوں روایت کی گئی ہے۔

(قال ابوبکر الخطیب فی الکفایۃ) اخبرنا ابو محمد الحسن بن علی بن احمد بن بشار النیسابوری بالبصرۃ قال ثنا ابوبکر محمد بن احمد بن محمویہ العسکری قال ثنا سلیمان بن عبدالحمید البھرانی قال ثنا علی بن عیاش وابوالیمان قالا حدثنا حریز بن عثمان قال حدثنی عبدالرحمن بن ابی عوف الجرشی عن المقدام بن معدیکرب عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال الا انی اوتیت الکتاب ومثلہ معہ، الا انی قد اوتیت القرآن ومثلہ۔ الا یوشک رجل شبعان علی اریکتہ یقول علیکم بھذا القرآن فما وجدتم فیہ من حلال فاحلوہ۔ وما وجدتم فیہ من حرام فحرموہ۔ الا لا یحل لکم الحمار الاھلی ولا کل ذی ناب من السباع ولا لقطۃ من مال معاھد الا ان یستغنی عنھا صاحبھا۔

---

[1] "مصیصہ" لب اللباب میں بکسر میم وتشدید صاد اول لکھا ہے مگر قاموس میں مصیصہ کو بفتح اول اور بغیر تشدید کے "سفینہ" کے وزن پر لکھا ہے۔ اور تصریح کردی ہے کہ ولا تشدد۔ ابوالعلاء المعری کا یہ مصرعہ بھی صاحب قاموس کی تائید کررہا ہے ؎ لولا المصیصی کان المجد فی مضر۔ مگر ابن السمعانی کتاب الانساب میں صاحب لب اللباب ہی کی تقلید کررہے ہیں اور بالکسر بتشدید صاد اول لکھتے ہیں۔ واللہ اعلم ۱۲ منہ غفرلہ

یعنی ابوبکر خطیب بغدادی نے اپنی کتاب کفایہ میں لکھا ہے کہ ہمیں خبر دی ابو محمد الحسن بن علی بن احمد بن بشار النیساپوری نے بصرہ میں۔ ان سے حدیث بیان کی ابوبکر محمد بن احمد بن محمویہ العسکری نے ان سے بیان کی سلیمان بن عبدالحمید البہرانی نے۔ ان سے علی بن عیاش اور ابوالیمان (حکم بن نافع) نے۔ ان دونوں نے کہا کہ ہم سے حدیث بیان کی حریز بن عثمان نے۔ انھوں نے کہا کہ ہم سے حدیث بیان کی عبدالرحمٰن بن ابی عوف الجرشی نے انھوں نے حضرت مقدام بن معدی کرب سے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ یاد رکھو کہ میں کتاب دیا گیا ہوں اور اس کے مانند (اور بھی) اسی کے ساتھ۔ یاد رکھو کہ میں قرآن دیا گیا ہوں اور اس کے مانند۔ یاد رکھو کہ عنقریب ایک شخص جس کا پیٹ بھرا ہوگا اپنے تخت پر بیٹھا ہوا کہے گا کہ لازم پکڑو اسی قرآن کو۔ تم جو کچھ اس قرآن میں حلال پاؤ اس کو حلال سمجھو اور جو کچھ اس میں حرام پاؤ اس کو حرام سمجھو۔ یاد رکھو تمہارے لئے اہلی حمار (پالتو گدھے) کا گوشت حلال نہیں اور نہ کسی نوکیلے دانت والے درندے کا گوشت۔ اور نہ پڑا ہوا مال کسی ایسے کافر کا جس سے صلح کا معاہدہ ہو چکا ہو مگر یہ کہ وہ اپنے اس مال سے بے پروا ہو چکا ہو۔[1]

یہی روایت ہے جو تھوڑے تھوڑے اوّل بدل اور کمی بیشی کے ساتھ بائیس طرق سے پانچ صحابہ اور ایک تابعی سے مروی ہے بعض روایات میں کچھ غیر معمولی اور اہم فرق ہے اس کو اس روایت کی تنقید کے وقت ظاہر کر دیا جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

بائیس طرق کے سلسلۂ اسناد

حضرت مقدام بن معدی کرب کی طرف منسوب جو دس طریقوں سے یہ حدیث منسوب کی گئی ہے اس کے سلسلۂ اسناد کو ملاحظہ فرمائیے:۔

یہ روایتیں جو مقدام بن معدیکرب کی طرف منسوب ہیں ان کو حضرت مقدام سے صرف دو شامی روایت کرتے ہیں ایک تو حسن ابن جابر اللخمی الشامی دوسرے عبدالرحمٰن بن ابی عوف الجرشی الشامی الحمصی۔ اول الذکر صاحب سے اس حدیث کے سوا اور کوئی حدیث مروی نہیں ہے۔ یہ صرف اسی حدیث کو روایت کرنے کے لئے زمرۂ رواۃ میں داخل ہو گئے یا داخل کر دیئے گئے۔ دوسرے صاحب شامی تو تھے ہی، شام کے مشہور شہر حمص کے قاضی بھی تھے اسی لئے بعضوں نے شامی تابعی ثقہ لکھ دیا ہے مگر یحییٰ بن سعید القطان نے صاف کہدیا کہ یہ مجہول الحال ہیں یعنی ان کا ثقہ یا غیر ثقہ ہونا معلوم نہ ہو سکا۔ صرف تابعی ہونے سے ثقہ کہدینا صحیح نہیں۔

پھر اول الذکر یعنی لخمی صاحب سے معاویہ بن صالح الحمصی الشامی ہی صرف اس کی روایت کرتے ہیں۔ معاویہ بن صالح کے متعلق تہذیب التہذیب میں ہے کہ یحییٰ بن سعید ان کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے، اور ابن معین ان کو ناپسندیدہ شخص قرار دیتے تھے اور جب

---

[1] پالتو گدھے کا گوشت خود محدثین کے نزدیک مختلف فیہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس کو حرام نہیں سمجھتے تھے جیسا کہ آخر کتاب میں آپ پڑھیں گے باقی رہا ان دونوں کا گوشت تو وہ قرآن ہی سے حرام ہے۔ احلت لکم بھیمۃ الانعام سے ظاہر ہے کہ غیر بہیمۃ الانعام یعنی درندے حرام ہیں۔ پڑا مال کسی کا بھی ہو جب اس کا مالک معلوم ہے یا جب تک اس کا گمان ہے کہ اس کا مالک آجائے گا اس وقت تک عقلاً حرام ہے اور قرآن سے بھی۔ معاہد کفار یا ذمیوں کا معاملہ وہی ہے جو عام مسلمانوں کا ہے۔ معاہدے جس انداز کے ہوں ان کی پابندی قرآن کی رو سے فرض ہے۔ غیر معاہد بھی جو غیر حربی ہیں ان کے مال پر بھی بیجا تصرف جائز نہیں البتہ جو حربی ہیں جن سے جنگ جاری ہے یا جو جنگ پر تلے ہوئے ہیں ان کو ضرور ہر ممکن نقصان پہنچانا عقلاً جائز ہے۔ قرآن بھی اس کی اجازت دیتا ہے۔ ۱۲ منہ غفرلہ

عبدالرحمٰن بن مہدی ان کی حدیث روایت کرتے تھے تو یحییٰ بن سعید ابن مہدی کو ڈانٹتے تھے۔ اور ابو اسحٰق الفزاری نے کہا کہ "یہ شخص اس قابل نہیں ہے کہ اس کی کوئی حدیث روایت کی جائے"۔ اور ابو حاتم نے کہا کہ "ان کی حدیثیں سند و حجت نہیں ہیں"۔

زید بن حباب الخراسانی الکوفی اس حدیث کو بواسطہ معاویہ بن صالح ہی روایت کرتے ہیں مگر ایک طریق میں بلاواسطہ یہ حسن بن جابر اللخمصی الحمصی سے روایت کرتے ہیں جو ناممکن ہے اسلئے کہ حسن بن جابر اللخمی کی وفات ۱۲۶ھ میں ہے اور زید بن حباب کی وفات ۲۰۳ھ میں ۷۲ برس کی عمر میں ہے یعنی زید بن حباب حسن بن جابر اللخمی کی وفات کے چار سال بعد پیدا ہوئے تھے اسلئے یقیناً اس سلسلۂ روایت میں جو مسند امام احمد میں مذکور ہے۔ راوی کو دونوں کا سال وفات معلوم نہ تھا اسلئے دروغ بے فروغ کا مرتکب ہو گیا۔ اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ غلطی سے معاویہ بن صالح کا نام زید بن حباب کے نام کے بعد چھوٹ گیا ہے۔ اسلئے کہ پہلے زید بن حباب کی روایت بواسطہ معاویہ بن صالح، حسن بن جابر اللخمی سے لکھکر پھر تحویل کی نوعیت قائم کرکے زید بن حباب کی روایت بلاواسطہ حسن بن جابر سے بیان کی ہے۔ اگر یہاں بھی معاویہ بن صالح کا نام موجود ہی ہے اور کاتب سے چھوٹ گیا ہے تو یہ اصل روایت کا اعادہ فضول ہوا، تحویل[1] نہ ہوئی۔ اسلئے ضرور یہ تحویلی نوعیت معاویہ بن صالح کی بغایت مجروحیت کو دیکھتے ہوئے قائم کی گئی تاکہ یہ کہنے کا موقع ملے کہ زید بن حباب، معاویہ بن صالح کی وساطت ہی سے یہ روایت نہیں کر رہے ہیں کہ معاویہ بن صالح کی مجروحیت کا اثر اس روایت پر پڑے، بلکہ بلاواسطہ معاویہ بن صالح بذاتِ خود بھی حسن بن جابر سے اس حدیث کی روایت کر رہے ہیں اسلئے معاویہ بن صالح کی مجروحیت اس حدیث پر اثر انداز نہیں ہو سکتی مگر دروغ گو را حافظہ نباشد۔ زید بن حباب کی عمر اور حسن بن جابر کا سالِ وفات راوی صاحب کو یاد نہ رہا اور اس کا خیال نہ رہا کہ زید بن حباب کی تو ولادت ہی حسن بن جابر کی وفات کے تین چار برس بعد ہے اسلئے زید بن حباب کی روایت بلاواسطہ کسی کے حسن بن جابر سے کس طرح ممکن ہے؟

تو حسن بن جابر اللخمی الشامی سے جتنی روایتیں بھی حضرت مقدام بن معدی کرب کی طرف منسوب ہیں وہ سب کی سب بلا استثناء معاویہ بن صالح الشامی الحمصی ہی سے مروی ہیں اور انھیں کی من گھڑت ہیں۔ اور ان کا حال ہم اوپر لکھ چکے۔

اب عبدالرحمٰن بن ابی عوف الجرشی الحمصی جو حضرت مقدام بن معدی کرب سے روایت کرتے ہیں۔ اس سلسلۂ روایت کو بھی سُن لیجئے۔ تو صرف ایک سلسلۂ روایت جو دارقطنی میں ہے اس میں عبدالرحمٰن بن ابی عوف الجرشی الحمصی سے مروان بن روبۃ الحمصی

---

[1] اصل روایت یوں ہے حدثنا عبداللہ قال حدثنی ابی ثنا عبدالرحمٰن وزید بن حباب قالا ثنا معاویہ بن صالح عن الحسن بن جابر قال زید فی حدیثہ حدثنی الحسن بن جابر قال سمعت المقدام بن معدی کرب یقول۔ یعنی امام احمد سے عبدالرحمٰن بن مہدی اور زید بن حباب دونوں نے معاویہ بن صالح سے اور انھوں نے حسن بن جابر سے روایت کی۔ مگر تنہا زید بن حباب نے بلاواسطہ بذات خود حسن بن جابر سے بھی روایت کی "اس روایت کو بھی سن لیجئے قال سمعت المقدام بن معدی کرب یقول حرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم خیبر اشیاء ثم قال یوشک احدکم ان یکذبنی وھو متکئ علی اریکتہ یحدث بحدیثی فیقول بیننا وبینکم کتاب اللہ فما وجدنا فیہ من حلال استحللناہ وما وجدنا فیہ من حرام حرمناہ۔ الا وان ما حرم رسول اللہ مثل ما حرم اللہ۔ یعنی حسن بن جابر نے کہا کہ میں نے مقدام بن معدی کرب کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلعم نے خیبر کے دن چند چیزیں حرام کیں۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ ملاحظہ ہو)

ان سے محمد بن الولید الزبیدی الحمصی۔ ان سے بقیۃ ابن الولید الحمصی، ان سے ابو عتبہ احمد بن الفرج الحمصی، ان سے محمد بن سلیمان النعمانی، اُن سے دارقطنی روایت کرتے ہیں۔ دارقطنی کے شیخ محمد بن سلیمان النعمانی تو بالکل مجہول الحال ہیں جن کا ذکر کتب رجال میں نہیں ملتا۔ مگر ان سے اوپر مقدام بن معدی کرب کے بعد سے ہر راوی شامی حمصی ہے۔ بقیۃ بن الولید الحمصی کے متعلق تہذیب التہذیب میں ابن حجر لکھتے ہیں کہ ہر آنے والے جانے والے سے یہ حدیث لکھ لیا کرتے تھے۔ ابن عیینہ لوگوں کو منع کرتے تھے کہ بقیہ سے سنن کی حدیثیں نہ لکھا کرو۔ یہ متروکین اور ضعفاء سے روایت کیا کرتے ہیں اور ان کے ناموں اور کنیتوں میں ہیر پھیر کیا کرتے ہیں۔ ابو حاتم نے کہا کہ ان کی حدیث لکھ لی جائے مگر وہ سند وحجت نہیں ہے۔ ابو مسہر غسانی نے کہا کہ بقیۃ لیست احادیثہ نقیۃ فکن منہا علی تقیۃ یعنی بقیہ کی حدیثیں (خلشوں سے) پاک نہیں ہیں اسلئے ان کی حدیثوں سے بچتے ہی رہنا چاہئے۔ امام احمد نے کہا کہ بقیہ نے عبید اللہ بن عمر سے بہت سی منکر حدیثیں روایت کی ہیں۔ ابن خزیمہ نے کہا کہ بقیہ کی حدیثوں کو میں حجت نہیں سمجھتا۔ امام احمدؒ نے یہ بھی فرمایا کہ میں سمجھتا تھا کہ بقیہ صرف غیر معروف ہی لوگوں سے منکر حدیثیں روایت کرتے ہیں مگر یہ تو مشہور لوگوں سے بھی منکر حدیثیں روایت کرتے پائے جاتے ہیں۔ تو ہم نے غور کیا کہ آخر کہاں سے یہ حدیثیں لائے؟ تو پتا ملا کہ تدلیس کے ذریعے۔ (یعنی مجہول راویوں کا نام اڑا کر ان کی جگہ مشہور راویوں کا نام رکھدیا کرتے تھے)

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) پھر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ عنقریب تم میں کا کوئی مجھکو جھٹلائیگا اور وہ تکیہ لگائے اپنے تخت پر ہوگا میری حدیث بیان کی جائیگی تو وہ کہے گا ہمارے تمہارے درمیان کتاب اللہ ہے تو ہم لوگ کتاب اللہ میں جس کو حلال پائیں اس کو حلال سمجھیں اور جس کو اس میں حرام پائیں اس کو حرام قرار دیں۔ یاد رہے اللہ کے رسول نے جس کو حرام کیا وہ اس کے مانند ہے جس کو اللہ کے حرام کیا ہے۔" تقریباً بالکل انہی الفاظ میں یہی حدیث ابوبکر خطیب نے عبید اللہ بن ابی الفتح الفارسی سے، انھوں نے ابوحفص عمر بن محمد بن علی بن زیات سے ۳ اور پھر ابوبکر خطیب نے ابوالحسن علی بن طلحہ بن محمد المقری اور ابوالحسن احمد بن عمر بن روح النہروانی سے اور ان دونوں نے ابوحفص عمر بن محمد بن علی بن زیات مذکور سے اور ابن زیات مذکور نے عبد اللہ بن محمد بن ناجیہ سے انھوں نے عمرو بن علی ابوحفص الصیرفی سے انھوں نے عبد الرحمٰن بن مہدی سے ۳ اور پھر ابوبکر خطیب نے علی بن محمد بن عبد اللہ سے انھوں نے دُعلج بن احمد سے انھوں نے ابن شیرویہ سے انھوں نے اسحٰق بن راہویہ سے اور وہ عبد الرحمٰن بن مہدی مذکور سے اور عبد الرحمٰن بن مہدی مذکور معاویہ بن صالح سے، وہ حسن بن جابر سے اور وہ مقدام بن معدی کرب سے۔ کفایہ میں لکھتے ہیں فرق صرف اس قدر ہے کہ اس روایت میں یوشك احدکم ان یکذبنی کا لفظ نہیں ہے صرف یوشك رجل منکی علی اریکتہ یحدث بحدیثی الخ ہے۔ اور آخر میں مثل ما حرم اللہ کے بعد عزوجل کا لفظ بڑھا ہوا ہے اور اس کے اسناد میں زید بن جاب کا نام نہیں ہے۔ بہرحال یہ تمام طرق اور ساری تحویلات معاویہ بن صالح الشامی الحمصی کی شکم زاد ہیں۔ ان کے بعد والوں کی کثرت طرق و تحویلات اس روایت کو مطلق قوت نہیں پہنچا سکتے۔ جب کہ اس کی جڑ ہی کھوکھلی ہے اس لئے کہ جو شخص بھی اس کو روایت کرتا ہے وہ معاویہ بن صالح ہی سے روایت کرتا ہے اور ان کا حال متن میں ہم لکھ چکے کہ یہ "اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی کوئی حدیث روایت کی جائے"۔ خصوصاً جو حدیث درایت قرآنیہ کے بالکل خلاف ہو۔ بلکہ قرآن کی تکذیب کر رہی ہو۔ ان تمام حدیثوں کے الفاظ ان کا عنوان بیان اور ان کی رکاکت مضمون پکار پکار کر اپنی موضوعیت و مکذوبیت کی شہادت دے رہی ہے۔ جس کو تھوڑی سی بھی بصیرت فی الحدیث ہو وہ اس کو پہلی نظر میں سمجھ لے سکتا ہے مگر خدا برکرے جذبۂ روایت پرستی کا کہ کیسے کیسے ماہرین و ناقدین حدیث اپنی غرض کے ماتحت ایسی لغو اور کچر موضوعات کو حدیث نبوی قرار دے کر اس سے استناد کرنے لگے۔ سچ ہے حبك الشئ یعمی ویصم ..... آدمی غرض کے پیچھے باؤلا ہو جاتا ہے۔ حق و باطل کچھ نہیں سمجھتا ۱۲ منہ غفرلہ

اور بھی بہت کچھ بقیہ کے متعلق لکھا ہے۔ بقیہ ۱۱۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷ھ میں وفات پائی۔ مگر اب بقیہ کے شاگرد صاحب کا حال سنئے اس حدیث کو بقیہ سے احمد بن الفرج ابو عتبہ الحمصی روایت کر رہے ہیں۔ یہ جامع حمص میں موذن تھے۔ محمد بن عوف نے ان کو جھوٹا کہا اور ان کی بری حالت بتائی، ابو ہاشم عبد الغفار بن سلامہ نے بھی بیان کیا کہ ہم نے اپنے اکثر شیوخ سے ان کے جھوٹے ہونے کے متعلق سنا۔ یہ بھی صاف لکھدیا کہ بقیہ کی جو حدیث بھی یہ روایت کرتے ہیں اس کی کوئی اصل نہیں ہوتی۔ ان کی حدیثوں کے متعلق یہ اَلْکَذِبُ الْخَلْق ہیں۔ اتنی تصریح کے بعد دارقطنی کی اس روایت کے متعلق کچھ کہنے کی اب ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

اب ایک آخری سلسلہ حضرت مقدام بن معدی کرب کی طرف منسوب حدیث کا رہ گیا اور وہ صرف حریز بن عثمان الحمصی سے چلتا ہے۔ یہ حریز صاحب نہایت کٹر قسم کے خارجی مشہور ہیں، ان کا معمول تھا کہ صبح شام ستر ستر مرتبہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر لعنت کیا کرتے تھے اور مسجد میں جاتے تھے تو نماز کے بعد بغیر ستر مرتبہ لعنت کے مسجد سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ شیعوں نے ایک جھوٹی حدیث بنا کر جو مشہور کی کہ انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو فرمایا کہ تم میرے لئے ویسے ہی ہو جیسے ہارونؑ موسیٰؑ کیلئے تھے، تو اس کو سن کر حریز حمصی نے کہا کہ آنحضرت صلعم نے یوں نہیں فرمایا تھا بلکہ یوں فرمایا تھا کہ انت منی بمنزلۃ قارون من موسیٰ۔ تم میرے لئے ویسے ہی ہو جیسے موسیٰؑ کیلئے قارون تھا۔ معاذ اللہ من ذلک۔

مگر تعجب یہ ہے کہ ان کے بعض شیوخ بھی شیعہ تھے اور بعض تلامذہ بھی شیعہ اور حدیثیں یہ شیعوں کے مسلک کے مطابق بہت روایت کیا کرتے ہیں جس سے شبہ یہ ہوتا ہے کہ شاید یہ بھی تقیہ کی ایک شکل ہو کہ اپنے کو خارجی مشہور کر کے شیعہ مذہب کے مطابق روایت کرتے رہو کہ یہ کہنے کا موقع ملے کہ یہ حدیث تو ایک سخت کٹر خارجی روایت کر رہا ہے۔ کوئی شیعہ اس کا راوی نہیں ہے۔ بہرحال محدثین ان کی حدیثیں روایت کرتے ہیں اور ان کو ثقہ سمجھتے ہیں مگر آپ کو ان کا حال معلوم ہو گیا کہ یہ شامی ہیں حمصی ہیں اور شیعوں نے ایک جھوٹی حدیث بنائی تو انھوں نے اس کے جواب میں اس سے زیادہ ناپاک جھوٹی حدیث بنا کر رسول اللہ صلعم پر اس کی تہمت لگائی۔ کیا اس پر بھی یہ ثقہ ہی رہیں گے؟

تو اب ان حریز سے یزید بن ہارون الواسطی العراقی ان سے احمد بن حنبل ان سے عبد اللہ بن احمد روایت کرتے ہیں۔ یزید بن ہارون واسط کے رہنے والے بین العراقین یعنی کوفہ و بصرہ کے درمیان شہر واسط ان کا گھر تھا ان کے متعلق تہذیب التہذیب میں ہے کہ لا یمیز ولا یبالی عمن روی یہ کچھ تمیز نہیں کرتے تے اور کچھ پروا نہیں کرتے تھے کہ کس سے روایت کر رہے ہیں۔ آنکھ سے معذور ہو گئے تھے تو اپنی لونڈی سے اپنی کتاب نکلوا کر لوگوں کو حدیث اس سے پڑھوا کر روایت کیا کرتے تھے جس سے حدیث لکھواتے تھے اس کا نام ہارون تھا وہ ان کی حدیثوں میں گھٹا بڑھا کر دیا کرتا تھا تو اس کو ڈانٹتے تھے اور کہتے تھے کہ تم جو کچھ کر سکتے ہو کرو مجھکو تیئس ہزار حدیثیں یاد ہیں، مگر پھر بھی لونڈی سے پڑھوا پڑھوا کر حدیث روایت کرتے تھے۔ اور اسی کاتب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی حدیثیں

تہذیب التہذیب میں ضحاک بن عبد الوہاب کا قول حریز کے متعلق لکھا ہے ھو متروکٌ متّھم۔ ازدی، ابن عدی وغیرہ نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ ان سے روایت کرنا نہیں چاہیئے۔ لیکن مسند امام احمد کے متعلق تو ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اسکو وضاعین وکذابین [illegible]

مرتب ومدوّن کیا ہے اسلئے اگر عالی سے عالی اسناد کے ساتھ بھی مسند احمد میں کوئی حدیث درایت قرآنیہ کے خلاف ہو تو اس کو موضوع ہی سمجھنا چاہیئے۔ متن حدیث کے ساتھ ساتھ اس کے وہ اسناد بھی موضوع ہیں۔ غرض مسند احمد کی کوئی حدیث بھی حجت وسند نہیں ہو سکتی۔

دوسرا طریق سنن ابوداؤد والا ہے جس کو حریز بن عثمان سے ابو عمرو بن کثیر بن دینار ان سے عبدالوہاب بن نجدہ ان سے ابوداؤد روایت کرتے ہیں۔ مگر نہ فقط شارحین ابوداؤد بلکہ دنیائے محدثین کو حیرت ہے کہ یہ ابو عمرو بن کثیر کون شخص ہے تمام شارحین ابوداؤد نے تمام کتابیں اسماء الرجال کی چھان ماریں مگر اس نام کا کوئی آدمی ملتا ہی نہیں۔ مولانا خلیل احمد دیوبندی رحمہ اللہ اپنی کتاب البذل المجہود فی شرح سنن ابی داؤد میں اس حدیث کی شرح لکھتے ہوئے، لکھتے ہیں کہ ابوداؤد کے تمام قلمی ومطبوعہ نسخوں میں اسی طرح ہے مگر میں نے اسماء الرجال اور حدیث کی تمام کتابیں چھان ڈالیں کہیں بھی اس نام کے مسمی کا پتہ نہ چلا۔ یہی حال مولانا شمس الحق مرحوم صاحب عون المعبود شرح سنن ابی داؤد کا ہے۔ بلکہ انھوں نے یہ بھی لکھدیا کہ منذری کے نسخۂ ابوداؤد میں یہ حدیث ہی نہیں ہے۔ غرض یہ ایک مفقود الخبر اسم بے مسمی سے روایت ہے اس کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے اور اس حدیث کو جو اس اسم بے مسمّی سے روایت کر رہے ہیں۔ عبدالوہاب بن نجدہ یہ بھی حمصی ہی ہیں۔ اسلئے ممکن ہے کہ اگر واقعی ابو عمر بن کثیر بن دینار کوئی شخص تھا تو وہ حمصی ہی ہوگا جو ایسا گمنام ہے جس کا کہیں پتہ نہیں ملتا کیونکہ عبدالرحمٰن بن ابی عوف الجرشی خود بھی حمصی تھے اور ان سے جتنے طرق سے بھی یہ حدیث روایت کی گئی ہے ان میں صرف حمصی ہی حمصی نظر آتے ہیں۔

اب ایک طریق اور باقی رہ گیا جسکو حریز بن عثمان الحمصی سے ابوالیمان[۱] حکم بن نافع الحمصی اور علی بن عیاش[۲] الحمصی دونوں روایت کرتے ہیں اور ان دونوں سے سلیمان[۳] بن عبدالحمید البہرانی الحمصی روایت کرتے ہیں۔ یہ سلیمان بن عبدالحمید البہرانی الحمصی ۵۹ برس کی عمر میں ۲۶۴ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے اور ابوالیمان کی وفات ۲۲۲ھ میں ہے اسلئے ابوالیمان کی وفات کے وقت یہ بہرانی صاحب سات برس سے زیادہ کے نہ تھے اور علی بن عیاش کی وفات ۲۱۹ھ میں ہے اس لئے ان کی وفات کے وقت بہرانی صاحب صرف چار برس کے تھے۔ تو یہ بہرانی، ابوالیمان اور علی بن عیاش سے کس طرح روایت کر رہے ہیں۔ جب ہی تو ان بہرانی صاحب کے متعلق امام نسائی نے فرمایا ہے کہ کذاب لیس بثقۃ ولا مامون۔ کذا فی تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۰۷ ترجمہ سلیمان بن عبدالحمید۔

تو حضرت مقدام بن معدیکربؓ کی طرف منسوب تمام طرق کا حال آپ کو آئینے کی طرح معلوم ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ تمام طرق شام کے مشہور شہر حمص ہی میں گھڑے گئے اور وہیں سے پھیلے۔

ابورافع والی حدیث

دوسری حدیث وہ ہے جو حضرت ابورافع کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ حضرت ابورافع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے۔ یہ روایت ان سے ان کے صاحبزادے حضرت عبیداللہ بن ابی رافع اور ان سے سالم ابوالنضر روایت کرتے ہیں۔ یہ سالم ابوالنضر عمر بن عبداللہ التیمی کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کی وفات ۱۲۹ھ میں اکسٹھ سال کی عمر میں ہوئی۔ اور عبیداللہ بن ابی رافع کی وفات فتنۂ عبداللہ بن الزبیر میں ۷۲ھ میں ہوئی۔ جسوقت سالم ابوالنضر صرف چار برس کے تھے

---

[۱] ابوالیمان مات علیٰ ما قال البخاری ۲۲۲ھ۔ [۲] علی بن عیاش ولادت ۱۴۳ھ وفات ۲۱۹ھ۔ [۳] سلیمان ۲۶۴ھ ... ابن ۵۹ سنۃ

اسلئے سالم ابوالنضر کا بلاواسطہ عبید اللہ بن ابی رافع سے روایت کرنا عقل کے خلاف ہے۔ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں سالم ابوالنضر کی روایت عوف بن مالک سے بھی مرسل ہی لکھی ہے اور عوف بن مالک کی بھی وفات ۷۳ھ ہی میں ہے۔ اسلئے حضرت ابورافع کی طرف منسوب حدیث کے بھی سارے طرق کو چونکہ سالم ابوالنضر ہی عبید اللہ بن ابی رافع سے روایت کر رہے ہیں اور سالم ابوالنضر کی روایت عبید اللہ بن ابی رافع سے بلاواسطہ صحیح نہیں ہو سکتی اسلئے یہ تمام طرق بھی حضرت مقدام بن معدیکرب کی طرف منسوب حدیث کے طرق کی طرح سرے سے موضوع اور محض افترا، اور عبید اللہ بن ابی رافع پر بہتان ہے۔

ابورافع والی حدیث کے راویوں میں بھی خراسانی، کوفی اور مجروحین ہی کی تعداد نظر آتی ہے۔ مگر اس شجرۂ روایت کی جڑ ہی جب کٹی ہوئی ہے تو خواہ مخواہ باقی راویوں کے حالات پر بحث کرکے مضمون کو طول کیوں دیا جائے اس لئے اس حدیث ابورافع کے متعلق اب کچھ اور لکھنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتا ہوں۔ درخانہ اگر کس است حرفے بس است۔

عرباض بن ساریہ والی حدیث

حضرت عرباض بن ساریہ کی طرف جو حدیث منسوب کی گئی ہے اسکی روایت حضرت عرباض سے حکیم بن عمیر الحمصی کرتے ہیں اور ان سے ارطاۃ بن المنذر الحمصی، ان سے اشعث بن شعبۃ الخراسانی المصیصی جن کے ضعیف الحدیث ہونے کی طرف صاحب مشکوٰۃ نے خود اس حدیث کو نقل کرکے اشارہ کیا ہے۔ اور ازدی[1] وغیرہ نے جن کو ضعیف الحدیث کہا ہے ان سے محمد بن عیسیٰ بن الطباع روایت کرتے ہیں جو اذنہ ساحل شام کے رہنے والے تھے ان سے محمد بن احمد بن الولید بن بردالانطاکی روایت کرتے ہیں۔ ان سے مکرم بن احمد بن محمد بن مکرم القاضی۔ ان سے ابوعلی الحسن بن ابی بکر بن شاذان اور ان سے ابوبکر خطیب بغدادی اپنی کتاب کفایہ میں لکھتے ہیں یہ ابوبکر بن شاذان در اصل فضل بن شاذان النیسابوری مشہور شیعہ محدث ہیں۔ ان کے بیٹے ابوعلی الحسن ہیں نیساپور کے رہنے والے اور کٹر رافضی تھے، یہ اور ان کے بھتیجے ابوسعید محمد بن موسیٰ بن فضل بن شاذان وضع احادیث میں بڑے ماہر تھے۔ خود شیعوں میں بھی ان دونوں چچا بھتیجے کا کوئی اعتماد وامتیاز نہ تھا۔ غیر معروف لوگوں سے باہر والوں کے سامنے روایت کیا کرتے تھے۔ چونکہ فضل بن شاذان باوجود شیعہ ہونے کے عام لوگوں میں ایک وقار واعتماد رکھتے تھے اس لئے ان کے بیٹے اور پوتے ان کے اثر سے ناجائز فائدہ اٹھا کر باہر والوں کے سامنے اپنی من گھڑت حدیثیں روایت کیا کرتے تھے۔ سنیوں کے رجال کی کتابوں میں تو ان جیسوں کا ذکر ہونے کی کوئی خاص وجہ نہ تھی مگر غیر ثقہ ہونے کی وجہ سے شیعوں کی بھی مختصر کتابوں میں ان دونوں کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ علامہ تفریسی نے اپنی کتاب نقد الرجال میں ان دونوں کا ذکر کیا ہے اور دونوں کو وضاع وکذاب لکھا ہے اور پھر خطیب بغدادی جن کی ولادت ۳۹۲ھ میں ہے یہ ۴۱۵ھ میں ۲۳ سال کی عمر میں نیساپور گئے تھے۔ اس وقت ان کو اتنی مہارت کہاں تھی کہ کھوٹے کھرے کی تمیز کرتے۔ فضل بن شاذان کا غلغلہ نیساپور میں سنا۔ ان کے بیٹے پوتے سے ملے اور ان سے حدیثیں بھی لے لیں۔

مگر یہ فضل بن شاذان صاحب کے بیٹے ابوعلی الحسن جن سے روایت کر رہے ہیں یعنی مکرم بن احمد بن محمد بن مکرم القاضی تو بالکل

---

[1] محمد بن الحسین ابوالفتح بن بریدہ الازدی الموصلی المتوفی ۳۷۴ھ ان کی کتاب جرح وتعدیل میں مشہور ہے ان کا ترجمہ ذہبی تذکرۃ الحفاظ ج۳ ص۱۶۶ میں اور ابن حجر نے لسان المیزان ج۵ ص۱۳۹ میں لکھا ہے ۱۲ منہ

مفقود الخبر شخص ہیں ان کا پتا کہیں نہیں ملتا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی کوئی اسم بے مسمّٰی ہے۔ اور یہ مکرم بن احمد صاحب روایت کرتے ہیں۔ محمد بن احمد بن الولید بن برد الانطاکی سے۔ ابن حجر اور حافظ ذہبی تو ان کا ذکر نہیں کرتے ہیں، مگر ابن السمعانی نے ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے ۲۸۶ھ میں ۵۹ سال کی عمر میں وفات پائی۔ مگر یہ انطاکی صاحب روایت کرتے ہیں محمد بن عیسیٰ بن الطباع سے جن کی وفات ۲۲۴ھ میں اور ولادت ۱۵۰ھ میں ہے۔ تو انطاکی صاحب تو ابن الطباع کی وفات کے وقت پانچ برس سے زیادہ کے نہیں ٹھہرتے۔ پھر یہ انطاکی کی روایت ابن الطباع سے کس طرح صحیح ہو سکتی ہے؟ دراصل یہ سلسلہ اسناد اُسی ابو علی حسن بن ابی بکر بن شاذان کی من گھڑت ہے۔ متن حدیث بھی گھڑ لی اور اسناد بھی جوڑ لئے۔ راویوں کے سنین ولادت و وفات کا یاد رکھنا خصوصاً اس وقت جبکہ یہ فن پوری طرح مرتب و مدون بھی نہیں ہوا تھا کچھ کھیل نہ تھا اور پھر کون اتنی کرید کرتا ہے یہ سمجھ کر انداز و قرائن سے کام نکالا مگر دروغ کو فروغ نہیں ہوتا۔ آخر کبھی نہ کبھی جھوٹ طشت ازبام ہو کر رہتا ہے جس کیلئے اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار برس کے بعد یہ وقت رکھا تھا۔

جابر بن عبداللہ والی حدیث

حضرت جابر بن عبداللہ کی طرف جو حدیث منسوب کی گئی ہے اس کی روایت حضرت جابر سے محمد بن عبد المنکدر کرتے ہیں اور ان سے صرف دو شخص عباد بن کثیر اور یزید الرقاشی۔ یزید بن آبان البصری الرقاشی کے بارے میں تہذیب التہذیب میں ہے کہ امام شعبہ فرماتے تھے کہ میں ان سے حدیث روایت کرنے سے زنا کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔ امام احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ اس کی حدیث لکھنی نہیں چاہیئے، یہ سخت منکر الحدیث ہے۔ نسائی اور حاکم نے کہا کہ یہ متروک الحدیث غیر ثقہ ہے اور یہ بھی کہا کہ اس سے حدیث روایت کرنا جائز نہیں ہے۔ وغیر ذالک۔

اور عباد بن کثیر البصری کو تو صاف وضاع و کذاب لکھا ہے۔ عباد بن کثیر سے اس حدیث کی روایت عباد بن صہیب . . . . کرتے ہیں جو اپنے استاد عباد بن کثیر سے بھی زیادہ اکذب الناس ہیں۔ ـ ۵

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

ابن عباس والی حدیث

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف منسوب دو حدیثیں ابوبکر خطیب نے کفایہ میں اس موقع پر نقل کی ہیں جن میں سے ایک مذکورہ بالا قسم کی حدیث ہے وہ یہ ہے۔ ابوبکر خطیب لکھتے ہیں مجھے خبر دی حسن بن ابی طالب نے ان سے عمر بن احمد بن عثمان الواعظ نے ان سے احمد بن اسحٰق بن البہلول نے ان سے ان کے والد (اسحٰق بن بہلول) نے۔ ان سے سمرۃ بن حجر نے ان سے حمزہ بن ابی حمزۃ النصیبی نے ان سے عمرو بن دینار نے ان سے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما بال اصحاب الحشایا یکذبونی عسی احدکم متکئ علی فراشہ یاکل مما افاء اللہ علیہ فیؤتی یحدث عنی الاحادیث یقول لا ارب لی فیہا۔ عندنا کتاب اللہ ما نہاکم عنہ فانتہوا وما امرکم بہ فاتبعوہ۔

یعنی رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ کیا حال ہے فرشوں والوں کا کہ جھٹلاتے ہیں مجھکو۔ عنقریب کوئی تم میں کا اپنے فرش پر تکیہ لگائے کھاتا ہوگا جو کچھ اللہ نے اس کو دیا ہے تو اس کے پاس میری حدیثوں میں کوئی حدیث بیان کی جائیگی تو وہ کہے گا کہ مجھکو ان سے کچھ کام نہیں۔ ہمارے

پاس کتاب اللہ ہے، جس سے کتاب اللہ نے تمہیں روکا ہے اس سے باز رہو اور جس کا تمہیں حکم دیا ہے اس کا اتباع کرو۔[1]

اس روایت میں وہ مثلہ معہ وغیرہ الفاظ تو نہیں ہیں مگر مضمون وہی ہے تو اب اس کے راویوں کو بھی دیکھ لیجئے۔ ابوبکر خطیب کے بعد ان کے شیخ سے پانچ سیڑھی تک تو مجاہیل اور غیر معروف لوگوں کے نام ہیں۔ چھٹے صاحب حمزہ بن ابی حمزہ النصیبی ہیں۔ جن کے بارے میں ابن حجر تہذیب التہذیب میں لکھتے ہیں کہ یہ عام طور سے جو حدیث بھی روایت کرتے ہیں وہ منکر ہی ہوا کرتی ہے اور موضوع۔ ثقہ لوگوں سے یہ موضوع حدیثیں روایت کیا کرتا ہے۔ ابن عدی نے کہا کہ یہ خود حدیثیں گھڑا کرتا ہے۔ وغیر ذلک۔ اب اس کے بعد اس حدیث کے متعلق نہ کچھ کہنے کی ضرورت ہے نہ کچھ پوچھنے کی۔

حضرت ابن عباسؓ کی دوسری حدیث رسول اللہ صلعم سے نہیں ہے بلکہ حضرت عمرؓ سے منسوب ہے اور مسئلہ رجم سے متعلق ہے۔ مسئلہ رجم کے متعلق بھی ایک مسودۂ مضمون میرے پاس تیار ہے مگر نظر ثانی اور صاف کرنے کا محتاج ہے اللہ نے چاہا تو کبھی وہ چیز بھی ہدیۂ ناظرین ہو جائیگی بہرحال یہاں چونکہ یہ چیز سامنے آگئی ہے تو اس کی تنقید پیش کئے دیتا ہوں:

ابوبکر خطیب کفایہ میں روایت کرتے ہیں حسن بن ابی بکر سے، وہ ابوسہل احمد بن محمد بن عبداللہ بن زیاد القطان سے۔ وہ اسمٰعیل بن اسحاق القاضی سے، وہ عبداللہ بن محمد بن اسماء سے، وہ مالک بن انس سے، وہ زہری سے وہ عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود سے وہ عبداللہ بن عباسؓ سے کہ انھوں نے کہا کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلعم کو مبعوث کیا اور ان پر کتاب اتاری اور جو کچھ نازل کیا تھا آنحضرت صلعم پر اس میں آیۃ رجم بھی تھی تو ہم لوگوں نے پڑھا اس کو اور سمجھا اس کو اور یاد کیا اسکو[2]۔ اور رسول اللہ صلعم نے رجم کیا اور آپ کے بعد ہم لوگوں نے رجم کیا۔ اور میں ڈرتا ہوں کہ لوگوں پر طولِ زمانہ گزر جائے تو کوئی شخص کہے کہ ہم کتاب اللہ میں آیۃ رجم نہیں پاتے ہیں تو ترک ہو جائے ایک فریضہ جسکو اللہ نے نازل کیا ہے تو بیشک رجم کتاب اللہ میں ہے حق ہے اس پر جو زنا کرے جب کہ وہ شادی شدہ ہو مردوں سے اور عورتوں سے جب کہ بینہ (گواہ دردلیل) اس پر قائم ہو جائے اگر وہ حمل ہو، یا اعتراف ہو۔

اس حدیث کے سلسلۂ اسناد میں اسمٰعیل بن اسحاق القاضی کا نام آپ نے دیکھا ان کے متعلق ابن حجر لکھتے ہیں کہ کان یضع الحدیث یعنی یہ حدیثیں گھڑا کرتے تھے۔ باقی تفصیلی بحث انشاء اللہ مسئلہ رجم والے مضمون میں آئیگی۔ یہاں اتنا ہی بہت ہے۔

علقمہ والی روایت اب رہ گئی صرف علقمہ والی روایت یہ بھی کوئی حدیث نبوی نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی صریح تعلق مثلہ معہ والے مضمون سے ہے۔ بلکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ایک استدلال ان سے روایت کیا گیا ہے وہ یہ ہے۔ ابوبکر خطیب

---

[1] حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی جو حدیث اس کے بالکل برعکس بخاری میں ہے وہ آگے متن میں آتی ہے بتائیے یہ حدیث صحیح ہے یا صحیح بخاری والی؟ ۱۲ منہ

[2] آیت رجم قرآن کی اور دوسری آیتوں کی طرح جب اتری اور صحابہؓ نے اس کو پڑھا سمجھا اور یاد بھی کیا۔ پھر اس پر عمل بھی ہوتا رہا عہد نبویؐ میں بھی اور عہد خلفائے راشدین میں بھی تو پھر قرآن سے اس کو خارج کس نے کیا؟ اور یہ کیوں قرآن سے نکال باہر کی گئی کہ بعد والوں کو اس کے متعلق یہ شبہ ہونے کا اسی وقت لوگوں کو گمان ہوا تھا کہ کوئی آیت منزل من اللہ نہیں ہے؟ اگر یہ واقعی حضرت عمرؓ کا قول ہوتا تو حضرت عمرؓ ضرور اس کو واضح فرما دیتے کہ فلاں وجہ سے اس آیت کو قرآن میں لکھا نہیں گیا۔ اس روایت کے الفاظ ہی اس کے کذب و افترا کی شہادت دے رہے ہیں۔ ۱۲ منہ

روایت کرتے ہیں عبداللہ بن یحییٰ العسکری سے وہ محمد بن احمد بن الحسن سے وہ بشر بن موسیٰ سے وہ حمیدی سے وہ سفیان سے وہ منصور بن معتمر سے۔ وہ ابراہیم نخعی سے وہ علقمہ سے کہ بنی اسد کی ایک عورت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس آئی اور اس نے ان سے کہا کہ مجھکو خبر ملی ہے کہ تم نے ایسے ایسے کہا ہے واشمہ[1] اور مستوشمہ کے متعلق۔ تو وہ کون سی قرابت ہے دونوں کے درمیان میں تو نہیں پاتی ہوں جس کو تم کہتے ہو اور میں اپنے متعلق اس کی وجہ سے گمان کرتی ہوں کہ میں ہلاک ہو جاؤں گی۔ حضرت ابن مسعودؓ نے اس سے کہا کہ جا گھر میں داخل ہو اور غور سے دیکھ۔ تو میں داخل ہوئی اور میں نے دیکھا تو کچھ بھی نہیں دیکھا تو پھر نکلی اور کہا حضرت ابن مسعودؓ سے کہ میں نے تو کچھ نہیں دیکھا۔ تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس سے فرمایا کیا تو نے نہیں پڑھا ما اٰتٰکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا۔ تو اس عورت نے کہا کہ ہاں۔ تو ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ وہ یہی ہے۔

یہ استدلال ان روایت پرست راویان حدیث کا بہت پرانا مگر سخت بودا استدلال ہے اور اس کو قوی و مستحکم کرنے کیلئے اس استدلال کو کبھی امام شافعی کی طرف منسوب کیا ہے کبھی کسی کی طرف اور یہاں کفایہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف اسکو منسوب کر دیا ہے۔

اس سلسلہ میں ابوبکر خطیب کے شیخ اور شیخ الشیخ تو مجہول الحال ہیں۔ مگر ان کے شیخ الشیخ کے شیخ بشر بن موسیٰ عجیب و غریب شخص ہیں معروف بھی اور مجہول بھی۔ مجہول اسلئے کہ رجال کی تمام کتابیں چھان ڈالئے کہیں آپ کو بشر بن موسیٰ کا پتا نہیں مل سکتا۔ اور معروف اس حیثیت سے کہ اگر "بشر" کی شین پر تشدید دیکر کھڑا زبر دیدیجئے اور اس کو بشار بن موسیٰ پڑھئے تو پھر بشار بن موسیٰ کو رجال کی جس کتاب میں ڈھونڈیئے آپ کو مل جائیں گے۔ مگر محدثین محض بخیال تدلیس سلسلۂ روایت میں ان کا نام ہمیشہ بغیر الف ہی کے لکھتے ہیں تاکہ ناواقف غریب کتب رجال میں اگر بے الف والے کو ڈھونڈے تو کہیں نہ ملے اسلئے کہ اس نام کا کوئی راوی حدیث ہے ہی نہیں اور الف کے ساتھ دیکھے تو سمجھے کہ یہ تو الف والا کوئی اور ہے۔ اور ہے درحقیقت وہی الف والا بشار بن موسیٰ جس کے متعلق ابن حجر تہذیب التہذیب میں لکھتے ہیں عمرو بن علی نے انھیں ضعیف الحدیث کہا۔ نسائی نے غیر ثقہ کہا۔ امام بخاری نے منکر الحدیث کہا۔ ابن معین نے بھی غیر ثقہ کہا اور دجالوں میں شمار کیا۔ وغیر ذلک ۲۲۸ھ میں دنیا سے سدھارے

غرض اس باب میں جتنی حدیثیں ابوبکر خطیب بغدادی نے اپنی کفایہ میں لکھی تھیں اور بھی بعض دوسری کتابوں میں شامیہ والی روایتیں ملیں، میں نے ان سب کی تنقید کر کے دکھادی کہ یہ سب روایتیں دراصل اہل شام خصوصاً اہل حمص و اہل نیشاپور اور خراسان و کوفہ و بصرہ و واسط والوں کی من گھڑت حدیثیں ہیں جو ایک مستقل سازش کے ماتحت گھڑی گئیں اور ان کی اشاعت کی گئی اور مصنفین کتب حدیث کی کتابوں میں کسی طرح سے داخل کرادی گئیں جن کی کتابوں میں داخل کی جا سکیں۔

حرمتِ حُمُرِ اہلیہ | ان بائیس طرق میں سے بعض طرق میں حمر اہلیہ یعنی پالتو گدھے کے گوشت کی حرمت کا بھی ذکر ہے۔ چنانچہ اوپر ص۵۵

---

[1] یعنی گودنا گودوانے والی۔ [2] یہ آیت سورۂ حشر کے پہلے رکوع میں ہے۔ مال غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں وارد ہے۔ عموم لفظ سے مفہوم کو وسعت بھی دی جائیگی تو کسی مناسبت کے ساتھ نہ کہ بے جوڑ، مال غنیمت پر صدقات و زکوٰۃ وغیرہ کی تقسیم میں بھی اس آیت کا عموم لفظ اثر انداز ہو سکتا ہے نہ کہ اس کے تحت میں حدیثیں بھی زبردستی کھینچ لی جائیں۔ بہرحال اگر حدیثیں بھی اسکے عموم میں کھینچ کر داخل کر لی جا سکتی ہیں تو صحیح حدیثیں جو واقعی ما اٰتٰکم الرسول ہوں نہ کہ وضاعین و کذابین کی من گھڑت روایت؟ جو حدیثیں قرآن کے خلاف ہوں وہ تو ما نھٰکم عنہ میں داخل ہیں نہ کہ ما اٰتٰکم میں ۱۲ منہ

میں جو حضرت مقدام بن معدیکرب سے ایک روایت بطور مثال پیش کی گئی ہے اس میں پالتو گدھے کے گوشت کی حرمت کا ذکر موجود ہے ان بائیس طرق میں سے چھ طرق میں حضرت مقدام کی طرف جو دس طرق منسوب ہیں ان میں سے پانچ طرق میں اور حضرت عرباض کی طرف تو ایک ہی حدیث منسوب ہے۔ اس ایک حدیث میں پالتو گدھے کی حرمت کا ذکر ہے۔ اور ابو رافع یا جابر بن عبداللہ وغیرہم کی روایتوں میں پالتو گدھے کا ذکر ہی نہیں ہے اور صرف مقدام بن معدیکرب کی دو روایتوں میں جن میں عبدالرحمٰن بن مہدی کا نام اسناد میں مذکور ہے یوم خیبر کا ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن چند چیزوں کو حرام کیا اور جو کچھ فرمایا کہ قرآن کے علاوہ بھی ہمیں قرآن ہی کے برابر ملا ہے، یا جس کو رسول اللہؐ نے حرام کیا وہ ویسا ہی ہے جیسا کہ اللہ نے حرام کیا وغیر ذٰلک۔ یہ سب خیبر ہی کے دن فرمایا۔ تو ان بائیس طرق میں سے صرف دو طرق میں یوم خیبر کا ذکر ہے۔ گو چونکہ ان بائیسوں طرق کے گھڑنے والے خراسانی، شامی، کوفی اور دوسرے عراقی وغیرہ ہیں جن میں شیعوں کی بھی کافی تعداد تھی اسلئے حمر اہلیہ کے گوشت کی حرمت کا تو ذکر کیا مگر متعہ کی حرمت کا ذکر کسی ایک روایت میں بھی نہیں کیا گیا۔ حالانکہ صحیح بخاری و صحیح مسلم کی حدیثوں میں یوم خیبر میں بعض چیزوں کی حرمت یا ممانعت کا ذکر ہے جن میں عورتوں کے ساتھ متعہ کرنے کی حرمت کا بھی ذکر ہے اور یہ سب لغویات کہ "ہم کو قرآن ملا ہے اور "مثلہ معہ" بھی"۔ یا "جس کو رسول اللہؐ نے حرام کیا وہ اس کے مثل ہے جس کو اللہ نے حرام کیا"۔ اور یہ کہ "عنقریب ایک شخص اپنے تخت پر تکیہ سے اڑا کہے گا کہ ہم کو حدیث کی ضرورت نہیں قرآن ہمارے لئے کافی ہے"۔ وغیر ذٰلک۔ یہ سب بخاری و مسلم کی کسی ایک روایت میں بھی نہیں ہے۔

صحیح بخاری و صحیح مسلم کی حدیثیں

صحیح بخاری میں "باب لحوم الحمر الانسیہ" ایک مستقل باب باندھ کر اس باب میں آٹھ حدیثیں درج کی ہیں۔ جن میں سے بعض میں یوم خیبر کی تصریح موجود ہے اور بعض میں لحوم الحمر کے ساتھ سباع ذی ناب (نوکیلے دانت والے درندے) کی بھی حرمت کا ذکر ہے اور بعض میں متعہ کی حرمت کا بھی۔

اسی طرح صحیح مسلم میں بھی "باب تحریم اکل لحم الحمر الانسیہ" کے تحت میں سترہ حدیثیں نقل کی ہیں۔ ان میں بھی بعض میں یوم خیبر کا ذکر موجود ہے اور بعض میں متعہ کی حرمت کا بھی ذکر موجود ہے مگر بخاری و مسلم کی ان پچیس حدیثوں میں سے کسی ایک میں بھی وہ مثلہ معہ وغیرہ خرافات جو کفایہ ابو داؤد و ترمذی و ابن ماجہ و مسند احمد کی بائیس حدیثوں میں مذکور ہیں کہیں ان کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اضافے خراسان ونیسا پور و شام و کوفہ و دیگر بلاد عراق میں بعد کو گھڑے گئے اور متاخرین کی کتابوں میں ان کے داخل کر دینے کا موقع مل گیا، مگر متقدمین کی کتابیں جن کی نقلیں کافی طور سے ممالک اسلامیہ میں اس وقت شائع ہو چکی تھیں ان میں بعد میں داخل کرنے کی گنجائش نظر نہ آئی۔ اسی لئے موطا اور صحیح بخاری و صحیح مسلم میں یہ اضافے درج نہ ہو سکے۔

محدثین کی کتابوں میں جھوٹی حدیثیں داخل کر دی جاتی تھیں

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اپنی کتاب تحفہ اثنا عشریہ ص۶۹ کید سی و دوم[۳۲] مطبوعہ نول کشور میں تحریر فرماتے ہیں:-

> در شہر دہلی در عہد بادشاہ محمد شاہ دو کس بودند از امرائے ایں فرقہ یعنی مرتضیٰ خان و مرید خان کہ کتب اہل سنت را مثل صحاح ستہ و مشکوۃ و بعضے تفاسیر بخط خوش مے نویسانیدند و دراں احادیث مطلب خود از کتب امامیہ برآوردہ داخل مے نمودند و آں نسخ را مجدول و مطلا مذہب نمودہ بقیمت سہل در گذری مے فروختند۔ و در اصفہان آغا ابراہیم بن علی شاہ، کہ یکے از امرائے کبار سلاطین صفویہ بود ہمیں اسلوب عمل کردہ۔

مگر یہ کوئی بیاد ستور اس جماعت کا نہ تھا۔ ابتدا سے روافض اور ملاحدۂ عجم جو خراسان، شام، عراق اور مصر وغیرہ میں تخریب اسلام کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے، ان میں سے ایک جماعت کا یہی دستور تھا چنانچہ ابن حجرؒ تہذیب التہذیب ج۸ ص۳۶۱ ترجمہ قتیبہ بن سعید بن جمیل میں لکھتے ہیں کان خالد المد ایئی ید خل الحدیث علی الشیوخ۔ خالد مدائنی اساتذۂ حدیث کی کتابوں میں حدیثیں داخل کردیا کرتا تھا اس کی موت ۲۱۱ھ میں ہوئی۔

حماد بن سلمہ کے ترجمے میں لکھتے ہیں کہ ان بعض الکذابین دخل فی حدیثہ ما لیس منہ بعض کذابین نے ان کی حدیثوں میں ایسی حدیثیں داخل کردیں جو ان میں نہ تھیں۔ آگے چل کر صاف لکھتے ہیں کہ انہا دُسّت فی کتبہ یعنی وہ حدیثیں ان کی کتابوں میں داخل کردی گئیں۔

ورّاقین وکتّاب ان وضاعین وکذابین میں کچھ لوگوں نے ورّاقی یعنی جلد بندی اور کتابت کا پیشہ اختیار کر لیا تھا جو محدثین کے تلامذہ میں داخل ہو کر پہلے محدثین میں اپنا رسوخ قائم کرتے تھے پھر اپنا پیشہ ظاہر کرکے ان سے کتابت کے لئے یا وراقی کے لئے ان کی کتابیں لیکر ان میں ... اپنی طرف سے حدیثیں داخل کردیا کرتے تھے اور ان کی حدیثوں میں گھٹا بڑھا بھی دیتے تھے۔ ابن حجرؒ احمد بن جوصا کے ترجمے میں لکھتے ہیں کہ ان کا ایک ورّاق تھا جو ان سے حدیثیں پڑھتا بھی تھا اور ان کی کتابیں نکالا رکھتا بھی تھا۔ تو اس سے ان کی کچھ ان بن ہوگئی تو انھوں نے اس کی جگہ ایک دوسرا وراق رکھنا چاہا تو اس پہلے وراق نے ان کی کتابوں میں کچھ ایسی حدیثیں داخل کردیں جو ان کی حدیثیں نہ تھیں جن کو یہ نادانستہ اپنی حدیثیں سمجھ کر روایت کرنے لگے۔ (لسان المیزان ج۱ ص۲۴۰)

حبیب بن ابی حبیب ابو محمد البصری۔ امام مالک کا کاتب تھا۔ وراقی بھی کیا کرتا تھا۔ حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں اور ابن حجر لسان المیزان میں اس کا مفصل حال لکھتے ہیں اور اس کو "اکذب الناس" لکھا ہے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ "مدینے میں وراقی کرتا تھا محدثین کی کتابوں کی، اور ثقہ لوگوں سے موضوع حدیثیں روایت کیا کرتا تھا۔ ان کی کتابوں میں وہ حدیثیں داخل کردیتا تھا جو ان کی حدیثیں نہیں ہوتی تھیں۔ لکھا ہے کہ اس کی کل حدیثیں موضوع ہی ہوا کرتی تھیں۔ ۲۱۸ھ میں مرا۔ (میزان الاعتدال ج۱ ص۲۱)

غرض جب یہ زبردست سازش تھی تو اگر صحاح ستہ اور خود موطا میں بھی بعض موضوع حدیثیں داخل کردی گئی ہوں تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ بخاری ومسلم کو حدیث کی دوسری کتابوں کے اعتبار سے ہم بھی زیادہ صحیح سمجھتے ہیں مگر ان کی حفاظت کا وعدہ قرآن کی طرح اللہ تعالیٰ نے نہیں کیا ہے۔ اسلئے اگر ان میں بھی دوسری کتابوں سے کم ہی سہی مگر تصحیف وتحریف ہوا اور کچھ غلط حدیثیں داخل کردی گئی ہوں اور بعض صحیح حدیثیں ان میں سے نکال دی گئی ہوں تو ان منافقین وملاحدۂ عجم کی زبردست سازش کے ہوتے کیا استحالۂ عقلی لازم آتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ حفاظت کا وعدہ صرف قرآن مجید ہی کے متعلق ہے اسلئے باوجود اتنی گہری سازشوں اور اسقدر اختلافات قرأت کے زبردست پروپگنڈے کے ساری دنیائے اسلام میں صرف وہی ایک قرأت متواترہ ومتوارثہ مروج ہے جو عہد نبویؐ سے آج تک کتابۃً تلاوۃً، قراءۃً اور حفظاً چلی آرہی ہے اور دوسری قرائتیں صرف علم قرأت کے مجلدات تفسیر اور روایات کے دفاتر اور فقہاء کی کتابوں ہی میں مدفون ہیں کتابت وتلاوت وقرأت وحفظ سے ان قرائتوں کا کوئی تعلق نہیں۔ تو جو حفاظت اللہ تعالیٰ نے صرف قرآن ہی کیلئے مخصوص رکھی ہے تو اس کو صرف قرآن ہی کیلئے مخصوص رہنا چاہئے۔ دوسری کوئی کتاب اس حفاظت ومحفوظیت میں اس کی شریک نہیں ہوسکتی۔

ابن عباسؓ کی حدیث بخاری میں اگر صحیح بخاری ہی میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت تو یہ ہے کہ انھوں نے پالتو گدھے کے گوشت کے حرام ہونے کو

انکار کیا اور قرآن کی یہ آیت پڑھی کہ قل لا اجد فیما اوحی الی محرما علی طاعم یطعمہ الآیہ[1] یعنی حضرت ابن عباسؓ نے قرآن سے استدلال کیا کہ بس قرآن نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے وہی حرام ہیں ان کے سوا اور کسی چیز کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ دیکھئے بخاری باب لحوم الحمر الانسیہ ج ۲ ص ۔ جس کی شرح میں ابن حجر فتح الباری میں حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول اور نقل فرماتے ہیں، لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جاہلیت والے بعض چیز کھاتے تھے اور بعض چیز کو ترک کر دیتے تھے اس کو نجس سمجھ کر۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا اور ان پر اپنی کتاب اتاری اور اس کتاب کے بتائے ہوئے حلال کو حلال کیا اور اسکے بتائے ہوئے حرام کو حرام کیا۔ تو جس کو اس کتاب میں حلال کیا ہے وہ حلال ہے اور جسکو اس کتاب میں حرام کیا ہے وہ حرام ہے اور جس سے سکوت اختیار کیا ہے تو وہ معاف ہے اور یہ آیت پڑھی قل لا اجد[1] آخر تک (فتح الباری ج ۲۳ ص ۳۱۳ مطبوعہ مطبع انصاری دہلی)۔ اب بتائیے حضرت ابن عباسؓ کی طرف جس حدیث کو حمزہ بن ابی حمزہ النصیبی جیسے وضاع وکذاب کی روایت سے منسوب کرکے ابوبکر خطیب اپنی کتاب کفایہ میں نقل کر رہے ہیں وہ صحیح ہے یا حضرت ابن عباسؓ کی وہ حدیث صحیح ہے جسکو امام بخاری اپنی کتاب صحیح بخاری میں روایت کر رہے ہیں اور ابن حجر فتح الباری میں نقل کر رہے ہیں؟

مشکوٰۃ میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ قرآن پانچ عنوانات پر اترا ہے حلال و حرام اور محکم و متشابہ اور امثال۔ تو اسی کے حلال کو حلال سمجھو اور حرام کو حرام سمجھو اور محکم پر عمل کرو اور متشابہ پر ایمان رکھو اور امثال سے عبرت حاصل کرو۔ دوسری حدیث حضرت ابو ثعلبۃ الخشنی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اللہ نے کچھ فرائض فرض کئے ہیں ان کو ضائع نہ کرو اور کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے تو ان کی خلاف ورزی نہ کرو اور کچھ حدود مقرر کئے ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور بغیر بھول چوک کے بعض چیزوں سے قصداً سکوت اختیار کیا ہے، ان کی کرید میں نہ پڑو۔

ترک بعض وحی

اگر واقعی رسول اللہ صلعم کو قرآن کے ساتھ "مثلہ معہ" بھی ملا تھا تو پھر آخر جس طرح آپ نے قرآن کی کتابت و تلاوت و قرأت و حفظ کا اور اسکی تعلیم کا انتظام فرمایا، حدیثوں کو کیوں بالکل چھوڑ دیا؟ کیا آنحضرت صلعم نعوذ باللہ فلعلک تارک بعض ما یوحی الیک کے خود کے مصداق بنے؟ یعنی جو آپ سے فرمایا گیا کہ شاید تم بعض وحی کو چھوڑ دو گے ان کفار و مشرکین کے خیال سے؟ (ہود ع ۲) تو آپ نے اس مثلہ معہ کو جو قرآن کے ساتھ آپ کو ملا تھا خود سے چھوڑ دیا اور ضائع ہونے دیا؟

سب سے پہلے حسبنا کتاب اللہ کہنے والے

اگر یہ کفایہ وغیرہ کی مثلہ معہ والی حدیثیں صحیح ہوتیں تو حضرت صدیق اکبرؓ پانچسو حدیثوں کو جمع کرکے جلا نہ دیتے اور حضرت فاروق اعظمؓ جمع سنن کا ارادہ کرکے پھر اس سے رک نہ جاتے اور یہ نہ فرماتے کہ "حسبنا کتاب اللہ" یعنی ہمارے لئے کتاب اللہ کافی ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم کے بعض خطبوں میں یہ موجود ہے کہ قرآن کے بتائے ہوئے حلال کو حلال سمجھو اور قرآن کے بتائے ہوئے حرام کو حرام سمجھو اور جس چیز سے قرآن نے سکوت اختیار کیا ہے اسکی کرید میں نہ پڑو۔ چونکہ طوالت کا خوف ہے ورنہ اس مضمون کے اقوال اکثر صحابہؓ کے ملیں گے اور اسکی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں مگر جو لوگ یستمعون القول فیتبعون احسنہ اور من القی السمع وھو شھید کے مصداق ہیں الذی جاء بالصدق وصدق بہ اولئک ھم المتقون کے مطابق سچی بات کے قبول کر لینے کیلئے ہر وقت تیار ہیں ان کیلئے جتنا لکھا جا چکا ہے وہی بہت کافی ہے اور جو لوگ روایت پرستی ہی کو دین سمجھتے ہیں ان کی ہٹ دھرم طبیعت کیلئے لاکھ دلائل پیش کئے جائیں وہ تو ماننے والے ہی نہیں ہیں اسلئے اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوں واللہ الموفق والھدایۃ من لدیہ والمرجع والمعاد الیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ وصلی اللہ علی سیدنا محمد والہ وصحبہ وبارک وسلم واخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین۔

---

[1] اس آیت کی تفسیر اور ترجمے میں مفسرین و مترجمین و محدثین نے صحیح راہ نہیں اختیار کی ہے اس روایت میں یہ عنوان بیان غلط ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کو اس طرح پیش فرمایا۔ راوی نے کچھ گڑبڑ کی ہے۔ میرا ایک رسالہ ہے الحلال والحرام من کلام اللہ العلام۔ اس میں قرآن مبین سے حلال و حرام کی مفصل بحث بھی ہے اور اس آیت کی صحیح تفسیر و ترجمہ بھی۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ کب اسکی اشاعت کا سامان کرتا ہے۔ اس کا قلمی مسودہ مدت سے رکھا ہوا ہے۔ ۱۲ منہ

نقد و نظر

اسلام اور فطرت

"اسلام دین فطرت ہے" یہ ایک ایسی آواز ہے جو مدت سے سنائی دیتی چلی آرہی ہے لیکن آج تک کوئی یہ نہیں بتا سکا کہ فطرت کہتے کسے ہیں اور اسلام کس طرح دین فطرت ہے۔ زیر نظر کتاب شیخ عبدالعزیز شاویش (مصری) کی کتاب "الاسلام دین الفطرت" کا اردو ترجمہ ہے۔ لیکن اس میں بھی یہ دعویٰ شرمندۂ معنی نہیں ہو سکا بلکہ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اسلام میں غلامی مقتضائے فطرت کے مطابق ہے۔ کتاب کا ترجمہ ابوتمکین افتخار احمد صاحب نے کیا ہے جو جماعت اسلامی کی مذہبیت سے کافی متاثر نظر آتے ہیں کیونکہ جہاں جہاں مصنف کوئی عقل کی بات کہنا چاہتا ہے یہ اسلامی جماعت کے انداز کے دلائل سے اسے پھر سے توہم پرستیوں کی طرف لیجانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کتاب مکتبۂ ایوانِ اشاعت آرام باغ روڈ کراچی کی طرف سے شائع ہوئی ہے اور قیمت عہ ہے۔

حیات جمال الدین افغانی

رضا ہمدانی صاحب نے اس چھوٹی سی کتاب میں (جو ایک سو انیس صفحات پر مشتمل ہے) سلجھے ہوئے انداز میں جمال الدین افغانی کے کوائف حیات کو بیان کیا ہے۔ کتابت اور طباعت دیدہ زیب ہے اور کتاب عہ میں گوشۂ ادب انارکلی لاہور سے مل سکتی ہے۔

روح، قرآن اور سائنس

یہ کتاب نہیں جہالت اور جرارت کی امتزاجی کوشش ہے۔ جہالت اس لئے کہ یورپ کے کچھ مداریوں نے کچھ عرصہ پہلے روحوں کے ساتھ ملاقاتیں کرنے کا تفریحی پروگرام اختیار کیا تھا۔ یہ صاحب اسے حقیقت سمجھ بیٹھے ہیں اور جرارت اس لئے کہ اس لغویت کی تائید میں بزعم خویش قرآن کی آیتیں پیش کر رہے ہیں۔ ایسی کتابوں کو دیکھکر جی چاہتا ہے کہ حکومت کی طرف سے کوئی کمیٹی ایسی ہونی چاہئے جو ہر کتاب کو اس کی اشاعت سے پہلے دیکھ لیا کرے۔ مصنف کے ساتھ پبلشر نے بھی کچھ کم جرارت کا ثبوت نہیں دیا جس کی طرف سے کتاب کے شروع میں لکھا ہے کہ "کتب بینی سب سے بڑی عبادت ہے"۔ یہ کتاب بھی گوشۂ ادب ہی کی طرف سے شائع ہوئی ہے اور قیمت عہ ہے۔

قطعات و رباعیات اکبر الہ آبادی

بزم اکبر کراچی نے اکبر اور اکبر کی شاعری کے متعلق تالیفات کا جو سلسلہ شروع کیا ہے۔ زیر نظر کتابیں (قطعات و رباعیات حصہ اول و دوم) اسی کی کڑیاں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر تمام اصناف سخن میں سے قطعات و رباعیات میں زیادہ نکھر کر سامنے آتا ہے۔ اور ان کی تشریح تبویب اور ترتیب میں بھیا احسان الحق صاحب نے محنت اور کاوش سے کام لیا ہے۔ بندیوں کی سہولت کے لئے ساتھ ساتھ الفاظ کے معانی دیئے گئے ہیں اور نیچے تشریحی نوٹ۔ طباعت کتابت اور جلد کی خوبصورتی بزم اکبر کی روایات کے مطابق ہے حصۂ اول

کی ضخامت چار سو صفحات اور قیمت صہ۔ حصہ دوم دو سو چالیس صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت ہے ہے۔

المسلمون عربی زبان میں ماہوار مجلہ جو سعید رمضان صاحب کی زیر ادارت، قاہرہ (مصر) سے شائع ہوتا ہے۔ اس وقت اس کے پہلے دو پرچے ہمارے سامنے ہیں۔ پرچہ نسخ کے ٹائپ میں عمدہ کاغذ پر چھپا ہے۔ بدل اشتراک سالانہ دس روپے۔ ششماہی چھ روپے۔ طلباء سے سالانہ آٹھ روپے، ششماہی چار روپے۔

جن حضرات نے مؤتمر عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کی ہے وہ مدیر رسالہ، سعید رمضان صاحب سے واقف ہوں گے۔ نہایت گرمجوش، جذباتی، خطیب قسم کے نوجوان۔ رسالہ کے مضامین قریب قریب تمام اساتذۂ مصر کے لکھے ہوئے ہیں۔ بعض قدیم انداز کے، بعض تجدد پسندانہ مسلک کے۔ خالص قرآنی فکر (جس کے کچھ آثار آپ کو پاکستان میں نظر آتے ہیں) کہیں نہیں۔ بایں ہمہ یہ رسالہ عربی دان حضرات کیلئے غنیمت ہے۔ کراچی میں غالباً "کارخانہ تجارت کتب آرام باغ روڈ" سے مل سکے گا۔

معراجِ انسانیت

(معارف القرآن — جلد چہارم)

ترجمانِ حقیقت، جناب پرویز کا قلم اور سیرتِ صاحبِ قرآن علیہ التحیہ والسلام، خود قرآن کے آئینہ میں، فی الحقیقت ہمارے اسلامی لٹریچر میں اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ شروع میں قریب پونے دو سو صفحات میں دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر ہے۔ اس میں بعض ایسے مذاہب کا بھی تذکرہ ہے جن کا شاید نام بھی آپ نے پہلے نہ سنا ہوگا۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرورِ کائنات جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ اصل کتاب بڑے سائز کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے مقدمہ وغیرہ کے ابتدائی پچاس صفحات اس سے الگ ہیں۔

کاغذ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط اور حسین۔ گردپوش مرصع اور دیدہ زیب۔ ٹائیٹل اور صبح بہار کے عنوانات منقش اور رنگین۔ قیمت بیس روپے۔ محصول ڈاک و پیکنگ ایک روپیہ ساڑھے چھ آنے۔

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ رابسن روڈ۔ کراچی

قرآنی لٹریچر کی تین اہم کتابیں

(۱) اسلامی نظام

اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت کے نظام اور آئین کے بنیادی اصول کیا ہیں اور وہ نظام آج کس طرح قائم ہو سکتا ہے۔ اس میں محترم پرویز صاحب اور علامہ اسلم جیراجپوری کے وہ اہم مقالات شامل ہیں جنھوں نے قوم کے سامنے قرآنی فکر کی نئی راہیں کھولدی ہیں۔ ضخامت ۱۸۴ صفحات، کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ قیمت مجلد مع گرد پوش دو روپیہ صرف (علاوہ محصولڈاک)۔

(۲) قرآنی دستور پاکستان

حکومت کی طرف سے پاس کردہ قرارداد مقاصد اور بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی پہلی رپورٹ پر قرآن کی روشنی میں تنقید، مولوی صاحبان کی طرف سے پیش کردہ بائیس نکات کا تجزیہ، اسلامی جماعت کی دستوری سفارشات اور ان کی فکر و نظر کے تضادات پر تبصرہ اور اس کے ساتھ اس قرارداد مقاصد اور دستور کے مسودات جنھیں طلوع اسلام نے قرآن کی روشنی میں مرتب کر کے حکومت کے پاس بھیجے۔ غرضیکہ اس مجموعہ میں وہ سب کچھ آگیا ہے جسے تدوین دستور پاکستان کے سلسلہ میں آپ کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ ضخامت تقریباً ۲۴۰ صفحات کتابت، طباعت اور کاغذ دیدہ زیب قیمت مجلد مع گرد پوش دو روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

(۳) اسباب زوالِ امت

محترم پرویز صاحب کا وہ معرکہ آرا مقالہ جس نے قوم کے سنجیدہ تعلیم یافتہ طبقہ کے قلب و نگاہ میں انقلاب پیدا کیا اور جس کے لئے کئی بار چھپنے کے باوجود پیہم تقاضے موصول ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ صحیح طور پر بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور اس کا علاج کیا۔ اس کتاب کا نسخہ ہر نوجوان کے سرہانے رہنا چاہئے کیونکہ اس سے ہم دوبارہ زندگی حاصل کر سکتے ہیں۔ ضخامت تقریباً ڈیڑھ سو صفحات۔ کتابت و طباعت اور کاغذ نہایت اعلیٰ۔ مجلد مع گرد پوش قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

ادارۂ طلوع اسلام۔ رالسن روڈ۔ کراچی

Regd. No. S.-1089

Bengal Oil Mills Ltd.

provides for:

Both

INTERNAL & EXTERNAL CLEANLINESS BY PRODUCING

Highly Vitaminised & Nutritive Cooking Oil

High Class Washing Soap which Cleanses Clothes 'Milky White'

BENGAL OIL MILLS LTD

Pakistan's Premier Oil & Soap Mills

(Inaugurated by QUAID-E-AZAM)

Telegrams: "BENGALI"

P. O. BOX No. 162
KARACHI-2

Telephone: Office: 3336, Mills: 2008

[illegible] Title Printed at Abbasi Litho Art Press [illegible] Karachi and Text Printed at Adbi Press, [illegible] Road, Karachi published by [illegible] from Tolu-e-Islam Office, Robeson Road, Karachi.